جُہد وعمل ۔۔۔۔قومی بیداری کیلئے!!!

ماہنامہ

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد)

جنوری 2014 شمارہ نمبر: 17 جلد نمبر: 2

فہرست

عالمی انسانی حقوق اور بلوچ قومی جدوجہد	اداریہ	2
قوم پرستی کا مطلب کیا؟	منظور عزت بلوچ	3
بلوچستان ۔حریت پسندوں کی محبت اور اختلافات	میر شیہک بلوچ	5
طویل انقلابی جدوجہد کی علامت نیلسن منڈیلا رخصت ہو گئے	علی شیر	7
تاریکی سے تاریکی کو ختم نہیں کیا جاسکتا	خالد سعید	10
تاریخ اور نسل پرستی	قندیل بلوچ	12
مینڈیلا کی زندگی کی کچھ ان کہی باتیں!	علی شیر	14
نرگسیت کا مرض	مبارک حیدر	16
ڈیرہ غازیخاں میں سرکار کے تماشے	دادشاہ بلوچ	18
''ماما کا سفر جاری ہے''۔۔۔۔۔	جوہر بلوچ	20
افسانہ: جڑواں بھائی بہن	ہوتمان بلوچ	24
انقلابی تحریکیں، آزمائشیں اور قومی جذبے	لکمیر بلوچ	26
سرمچار شہید حامد براہیم	حیریہ بلوچ	28
سلام فرزانہ مجید کو	صلاالدین بلوچ	29
ایک ہنستا مسکراتا چہرہ جو جسمانی طور پر ہم سے بچھڑ گیا	شپ چراگ بلوچ	30
کلان آپریشن کا ون مین آرمی!!	میار بلوچ	31
پارٹی اور طبقہ	ٹیڈ گرانٹ	33
آئینہ حقائق	ادارہ	36
غلامی قوموں کی خوشحال مستقبل قبضہ گیر کے۔۔۔۔۔	پمفلٹ	39
انسانی حقوق کا عالمی دن اور بلوچ	پمفلٹ	41
اخباری بیانات	ادارہ	42

www. sagaar.net Blog : azadmagazine.wordpress.com E-mail : azadmagazine@gmail.com

اداریہ

عالمی انسانی حقوق اوربلوچ قومی جدوجہد

10 دسمبر 1948 کو اقوام متحدہ کے جنرل اسمبلی میں ''انسانی حقوق کا عالمی منشور'' منظور ہوا جس کے تحت انسانوں کے وہ حقوق جو انہیں بغیر کسی رنگ، نسب، مذہب، شہریت اور سیاسی نظریہ کے تعصب سے حاصل ہیں۔ انسانوں کو صرف اور صرف انسان ہونے کی بنا پر جو حقوق حاصل ہیں انہیں باضابطہ طور پر متعین کیا گیا۔ اقوام متحدہ کی جانب سے ''عالمی انسانی حقوق کا منشور'' کی منظوری نہایت حوصلہ افزا اور انسان دوست قرار دی گئی کیونکہ صدیوں سے بنیادی طور پر انسانی حقوق کے تحفظ کی ناکامی کی وجہ سے دنیا افراتفری، قتل و غارتگری اور معاشرتی عدم استحکام کی شکار رہی ہے جس کی وجہ سے اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ مختلف اقوام کے درمیان باہمی بھائی چارے اور رواداری کو فروغ دیکر آئندہ کی نسلوں اور دنیا کو جنگ کی تباہ کاریوں سے روکنے کیلئے ایک اہم پیش رفت سمجھی گئی لیکن رفتہ رفتہ اقوام متحدہ اپنے منشور اور قواعد ضوابط پر عمل درامد کرنے سے قاصر ہونے کی وجہ سے روز بہ روز غیر موثر ہوتی جارہی ہے۔

10 دسمبر کو ہر سال کی طرح اس سال بی ''عالمی یوم انسانی حقوق'' منایا گیا اور عالمی انسانی حقوق کی تنظیموں کی جانب سے انسانی حقوق کی عالمی منشور کی افادیت واہمیت سمیت انسانی حقوق کی تعلیم وتبلیغ کیلئے مختلف پروگرامز منعقد کیئے گئے۔ البتہ یہ بات قابل افسوس ہے کہ آج بھی دنیا کے کئی ایسے ممالک اقوام متحدہ کے ممبر ہونے کے باوجود انسانی حقوق کی عالمی سفارشات کو پاؤں تلے روندھتے ہوئے، انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں کررہی ہیں اور دنیا میں آج بھی کئی مظلوم ومحکوم اقوام اپنے انسانی حقوق اور قومی حقوق کی جدوجہد میں برسرِ پیکار ہیں۔

بلوچ قوم کے انسانی اور قومی حقوق غصب کرنے کا سلسلہ بلوچ قومی ریاست پر انگریزوں کے قبضہ سے ہی شدت اختیار کرگیا اور اس کے بعد متواتر بلوچ قوم کی مرضی اور منشاء کے بغیر بلوچ قومی ریاست کو تقسیم در تقسیم کا شکار کیا جاتا رہا۔ بلوچ قومی ریاست پر قابض ریاستوں کے قبضہ کے بعد بلوچ قوم اپنے قومی اور انسانی حقوق سے محروم کردی گئی لیکن روز اول سے ہی ناجائز قبضہ اور بلوچ قوم کے قومی اور انسانی حقوق کی بحالی کیلئے بلوچ فرزند جدوجہد کرتے آرہے ہیں جس کو دبانے کیلئے قابض ریاستیں بلوچ قوم پر ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک روا رکھنے میں مزید شدت لاتی رہی ہیں اور اقوام متحدہ کے منشور اور اصولوں سمیت انسانی اقدار، اخلاقیات اور انسانی حقوق کی پامالیاں جاری ہیں۔ آج بھی مقبوضہ بلوچستان میں انسانی حقوق کی پامالیاں شدت سے جاری ہیں جسکے تدارک اور روک تھام کیلئے قوموں کے حقوق اور عالمی امن کی ضامن اقوام متحدہ سمیت عالمی معاشرہ خاطر خواہ اقدام کرنے سے قاصر رہی ہیں، کیونکہ اقوام متحدہ قابض ریاستوں کو مظلوم ومحکوم اقوام پر ظلم وجبر کرنے سے روکنے میں ہمیشہ ناکام رہی ہے اور اسی وجہ سے اقوام متحدہ کا منشور، انسانی حقوق کا عالمی منشور اور انسانی حقوق کے حوالے سے دیگر اعلامیہ صرف کاغذی سفارشات دکھائی دیتے ہیں جن پر اقوام متحدہ عمل درامد کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ ان حالات کے باوجود بلوچ قوم نے ہمیشہ اقوام متحدہ کے منشور اور عالمی قوانین کے عین مطابق اپنی سرزمین کی آزادی کی جنگ لڑی ہے اور تاحال بلوچ قومی آزادی کی جنگ عین عالمی قوانین کے مطابق لڑی جارہی ہے حالانکہ قابض ریاستوں نے ہمیشہ عالمی قوانین اور عالمی اصولوں کو پامال کرتے ہوئے ظلم وجبر کی داستان رقم کی ہے۔ بلوچ قوم کی موجودہ جدوجہد میں تاحال بلوچ قوم کے کئی فرزند شہید اور لاپتہ ہوگئے ہیں لیکن بلوچ قوم اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ بلوچ قومی جدوجہد دراصل قومی اور انسانی حقوق کی جدوجہد ہے اور اس بات سے بھی واقف ہے کہ دنیا میں امن انصاف، برابری اور رواداری کے اصولوں کو اپنانے سے ہی انسانیت کی بقاء مضمر ہے۔ اوران اصولوں کو پاؤں تلے روند کر عالمی امن اور بھائی چارے کی فضاء قائم کرنا ناممکن ہے کیونکہ بنی نوع انسان کی تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ تکلیف انسانوں نے ہی انسانوں کو دیا ہے جسکی وجہ سے انسان ہی انسانوں کا سب سے بڑا دشمن رہا ہے۔ بنی نوع انسان کو امن آتشی اور معاشرتی ترقی کی جانب سفر کرنے کیلئے ظلم وجبر، ناانصافی نابرابری کا خاتمہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری کرنی چاہیئے تاکہ معاشی، سیاسی اور معاشرتی ترقی کے بہتر مواقع میسر ہوسکیں۔ آج بلوچ قومی تحریک آزادی، انصاف، برابری اور ظلم وجبر کے خلاف اور قومی وانسانی حقوق کی بحالی کی خاطر جاری ہے۔

قوم پرستی کا مطلب کیا۔؟

منظور عزت بلوچ

مجھے نہیں پتہ کہ مجھے کیا لکھنا چاہیے اور اس موسم میں میرا موضوع کیا ہونا چاہیے ۔ایسا لگتا ہے کہ مجھے خود اپنی ذات سے سوال ہے۔حالانکہ میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ یقین کے بعد سوال، شکوہ اور وشکایت ،طلب کا تماشا، گلہ، وزاری شرعی طور پر جائز نہیں، مگر میں زندگی سے الگ کوئی دوسرا وجود تو نہیں۔سوچ انفرادی ہو یا قومی اس کی سطح کو بلند ہونے کے لیے، آہ کو چاہیے ایک عمر اثر ہونے تک۔اس لیے میں الگ ،زندگی الگ ، یہ فلسفہ نہ صرف بلوچ قوم ، بلکہ تمام مظلوم عوام کے سوچ پر جبری مشقت کے طور پر لاگو ہے کہ زندگی اور میں دو الگ الگ ذہنی جزیرے ہیں جو سماجی زلزلوں کے بعد فکری سمندر میں نمودار ہوتے ہیں۔اگر ہم اپنی سماجی روزمرہ معاملات زندگی کا ایمانداری سے جائزہ لیں تو واضح طور پر یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ ہمیں زندگی سے کوئی سروکار نہیں، اگر میں کہیں اپنی جھوٹی سخاوت کے ساتھ زندگی کے ساتھ رہوں، مگر زندگی میرے لیے نہیں ،کیوں۔؟ چونکہ اس کا جواب اس قوت کے پاس ہے، جس نے یہ جبری نظام قائم کیا ہے، اب وہ اس کا جواب دینے کے بجائے اس فورس کو استعمال کرتا ہے جس کی نشوونما صرف اور صرف بدی کے خاتمہ کرنے کی بنیاد پر کیا گیا ہے اور اس کے اندر ایک مصنوعی سوچ جبری طور پر ٹھونسا گیا ہے کہ اس کا نصب العین صرف اور صرف بدی کا مکمل طور پر خاتمہ ہے، مگر نیکی کا نام ونشان بھی اس فورس کے داخل میں موجود نہیں۔ جتنا ممکن ہو سکے ایک فوجی کو خطرناک ہونا چاہیے، اور اگر ہو سکے تو بھیانک بھی۔اس لیے تحریر سے لیکر تقریر تک ،مباحثوں سے لیکر مکالموں تک الفاظ کو دہکتے ہوئے انگار کے مترادف ہونا چاہیے، کیونکہ مجھے مر کر بھی یہ ثابت کرنا ہے کہ میں سب کچھ ہوں، یہ زندگی کچھ بھی نہیں۔ جنازوں کو کندہ دینے والی ہجوم گواہی ہے اس بات کہ ہم زندگی پرست نہیں۔گدھ ایک اڑنے والی گوشت خور جانور ہے، یہ عام طور پر کہیں بھی نظر نہیں آتا مگر جونہی یہ صدا فضاء میں گونج اٹھتی ہے کہ زندگی اب ہمارے درمیان نہیں رہا، فضاء گدھ کے کالی پروں کی سیاہ چادر سے ڈھک جاتی ہے، مردہ پرست قوم پرستی کی بنیاد زندگی کی نفی ہے۔اس لیے ہمارے لیے سفر کچھ بھی نہیں ،منزل ہی سب کچھ ہے۔ورکر کچھ بھی نہیں لیڈر ہی سب کچھ ہے، لیڈر کچھ بھی نہیں تحریک ہی سب کچھ ہے۔تحریک کچھ بھی نہیں ادارہ ہی سب کچھ ہے۔قصور مگر ہمارا نہیں کیونکہ ہم جس سماج میں رہائش پذیر ہیں یہاں سب کچھ ہے، صرف زندگی نہیں۔ بلوچی لفظ سرمچار کا مطلب ہی یہی ہے کہ سر کچھ بھی نہیں مطلب کہ زندگی مقصد کے آگے کچھ بھی نہیں جو کچھ ہے وہ بس مقصد ہی ہے۔ بقول فرانز فینن سیاسی قائد نے ایک فوجی جنرل کی طرح اپنے ہی عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ۔میرے مظلوم اور محکوم، پسماندہ، لاچار، بے روزگار، بھوک اور پیاس سے نڈھال ''مگر'' باشعور عوام۔اسلام علیکم! ''مگر'' کے ساتھ باشعور کیوں کہا جاتا ہے۔؟ ہمارا باشعور ہونا خود قائدین کے ہاں مگر کے ساتھ مشروط کیوں ہے،؟اس لیے کہ ہیرو ہی ہی سب کچھ ہے ہیرو بنانے والی قوت کچھ بھی نہیں۔غلامی اسی سوچ سے چمٹنے کا نام ہے اور آزادی اس سے چھٹکارہ پانے کا۔ اگر ہم یہ سوال کریں کہ ہم کس لیے لڑ رہے ہیں۔؟ جواب ہے کہ آزادی کے لیے، مگر آزادی کیا ہے۔؟ ہمارا مطالبہ کس سے ہے؟، ہماری آزادی کس کے پاس ہے۔؟ یہ کافرانہ سوال ہے، اس پر کفر کا فتوی لگ سکتا ہے۔حالانکہ جواب آسان ہے کہ جس نے ہم سے ہماری آزادی بندوق کی نوک پر چھین لیا وہی جو آج تک بندوق کی نوک پر اس پر قابض ہے۔شاید ہم کہہ رہے ہیں کہ قابض ہی سب کچھ ہے، مقبوضہ کچھ بھی نہیں۔سوال کیا یہ نہیں کہ۔بلوچ قوم سے بلوچ قوم کی آزادی کیوں چھینی گئی۔؟ ہم سیاسی طور پر چاہے کسی بھی فرقہ اور کسی بھی مسلک سے تعلق رکھتے ہوں ہم سب کا جواب یکسان ہے کہ قومی کمزوری کی وجہ سے ۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کمزوری کیا ہے، میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ کمزوری ہی سب سے بڑی کمزوری تھی، اور آج تک یہ کمزوری قائم ہے۔سوال طاقت کے حصول کا ہے ، کیونکہ وجہ کمزوری ہے، اب طاقت کا سرچشمہ تو قوم ہے۔اس لیے آزادی کا مطالبہ قوم سے ہونا چاہیے۔ یہ ایک قسم کی راہ فرار ہے اگر ہم تاریخ میں درج اس نشاندہی کی جانب پیش قدمی نہ کریں جس کی وجہ سے بلوچ قوم سے اس کی آزادی طاقت کے زریعے چھین لیا گیا۔اگر ہمارا یہ دعوی صحیح ہے کہ ہم سے ہماری آزادی طاقت کے زریعے چھین لیا گیا، حتی کہ ہم کہتے ہیں کہ بندوق کی نوک پر، یا بزور شمشیر۔تو آزادی کی تحریک کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ دائروں کی قید سے سب سے پہلے خود کو آزاد کریں۔آزادی دائروں کے نفی کا نام ہے۔دائروں کی قید سے آزادی سے

مراد کسی شے کی محوری گردش سے آزادی ہے جس کے نتیجے میں پورا جسم ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنی حالت تبدیل کرنے کے قابل رہتا ہے۔ غلامی سے آزادی تک ایک حالت سے دوسری حالت تک، نہ عبوری، نہ عمومی، نہ ضمنی نہ معروضی۔ ایک مکمل اور ہمیشگی تبدیلی جہاں انقلاب در انقلابات کے دروازے قوموں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہیں گے۔ مگر انقلاب در انقلاب، آزادی در آزادی کے یہ دروازے ہمیشہ اندر کی طرف دھکیلنے سے کھلتے ہیں، ہماری مظلومیت گذشتہ نصف صدی اور ایک معلوم دہائی سے اس دروازے کو کھولنے کی جدوجہد میں مصروف عمل ہیں مگر یہ دروازہ کھلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ صورتحال کچھ یوں ہے کہ منزلوں پہ آکے لٹتے ہیں دلوں کے کاروان۔ کشتیاں ساحل پہ اکثر ڈوبتی ہیں پیار کی۔ اس لیے منزلیں اب تک بھی اپنی جگہ ہیں اور راستے اپنی جگہ۔ سوال قدموں کا ہے جب قدم ہی ساتھ نہ دیں تو مسافروں کا فرض بنتا کہ وہ سوچیں کہ کیا کریں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ قربانی کے بغیر منزل تک پہنچنا ناممکن ہے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ قربانیوں کے تاریخ جنم لے رہے ہیں، ہزاروں لاپتہ افراد سینکڑوں مسخ شدہ لاشیں، ماؤں بہنوں کی لازوال قربانیاں اور ریلیاں اور لانگ مارچ۔ مگر اس کے باوجود پانچ دس ہزار نفوس کی آبادی کو اگر سوال کے طور پر سامنے رکھا جائے کہ اس گاؤں میں آزادی پسند کون کون ہیں، یقین کریں کہ ایک مقامی مخبر کی انگلیوں کے تیس پور بھی زیادہ پڑ جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ آزادی کا سوال میرے باطن میں کیوں قید ہے، وہ سوال پوری آبادی میں سرائیت کیوں نہیں کرتا۔؟ تاکہ مقامی مخبر کے پاس بھی جواب وہی رہے جو حقیقت میں موجود ہے کہ پوری آبادی ہی آزادی پسند ہے میں کس کس کا نام بیان کروں۔ مورچہ وہ نہیں ہے جو کسی بلند ترین پہاڑی چوٹی پر بھاری پتھروں سے بنائی گئی ہے، بلکہ اس بلند ترین پہاڑی کے دامن میں جو گاؤں ہے وہی سب سے مضبوط ترین مورچہ ہے۔ اس لیے میں ایک روایتی وجدان میں مبتلا ہو کر آپ سے یہ نہیں کہونگا کہ آپ آپس میں اتحاد قائم کریں، میرا مطالبہ یہ ہے آؤ آپس میں مکالمہ کریں۔ تاکہ ہم اپنے موضوع کے قریب پہنچ سکیں اور فکر کے زریعے اس منزل کو دریافت کریں جس کے لیے ہماری قومی ماضی نے قومی حال تک ہماری رہنمائی کی، اور حال ہمیں اپنے حالات کی حقیقت بیان کرنے کے لیے بطور فاعل بروئے کار لانے کی کوشش میں سرگرم عمل ہے۔ قوموں کو تاریخ میں فنا اور بقاء کے سوال پر فاعل کی سطح تک پہنچنے میں صدیوں کی مسافت خون کی سمندر میں طے کرنا پڑا، بلوچ قومی تحریک نے یہ مسافت ایک ایسے ہی خون کی سیلاب میں طے کی۔ اب ہمارے پاس ایک مشاہدہ ،موجود ہے جس کی بنیاد پر ایک قانون کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے، کیونکہ تمام تجربوں کا حاصل ایک اٹل قانون ہے۔ اگر غور فرمائیں آزادی ایک ایسے ہی قانون کا نام ہے جسے قوم ہی پار کرسکتی ہے، قوم کے علاوہ کسی کے بس میں یہ طاقت اور اختیار نہیں کہ وہ خون کی اس بے پیاں سمندر کو پار کر کے آزادی کی چراغ کو روشن کر سکے، اور میرے نزدیک یہ جنگ اس قوت اسی طاقت کو حاصل کرنے کی جنگ ہے، وہ قوت جس کی پرستش ہی اس تحریک کا نظریہ اور فلسفہ ہے۔ قوم پرستی کا مگر مطلب کیا؟۔؟ شاید یوں ڈوبنا کہ آس پاس کے لہروں کو پتہ نہ چلے!

”سرمایہ دارو! تم ہماری زندگی کا خاتمہ کر سکتے ہو مگر
ہماری تحریک کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔۔“

اینگل

بلوچستان ۔ حریت پسندوں کی محبت اور اختلافات

میر شیہک بلوچ

آج کل بلوچستان میں حریت پسندوں کے درمیان اختلافات کا چرچا ہے۔ پارلیمانی جماعتیں اور ردِ انقلابی اس صوتحال سے بہت خوش ہیں۔ وہ اپنی نجی محفلوں میں بڑی مسرت سے اس بات کا اظہار کرتے ہیں۔ کیا بلوچ قومی تحریک کیلئے یہ نیک شگون ہے؟

یہ درست ہے کہ اختلافات ہر تحریک میں ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا انقلابی لیڈر بھی غلطیوں سے مستثنیٰ نہیں۔ لیکن جس طرح سے ان مسائل کو آج کل سوشل میڈیا پر اٹھایا جارہا ہے جس کے باعث بہت سارے سوالات پیدا ہورہے ہیں۔ وہاں اس کے منفی اور مثبت اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

مثبت بات یہ ہے کہ تنقید کو علمی استعداد اور علمی سطح اور نظریاتی سوالات سے لیس ہونا چاہیئے ۔ بغیر استدلال کے، جوش اور جنونیت میں آکر بلوچستان سے محبت بھلا کس کام کی؟

اصل بات یہ نہیں ہے کہ یہ کس کا پرچم ہے؟ یہ کس کا مظاہرہ ہے؟ فلاں کیا کررہا ہے؟ فلاں کو ایسا کرنا چاہیئے ؟ فلاں ہیرو ورشپ کا شکار ہے؟ فلاں خود پسند۔ حتیٰ کہ نواب خیر بخش مری سے متعلق بھی ایسے سوالات پوچھے جارہے ہیں۔ جن کو پچگانہ ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

ضرورت اس بات کو سمجھنے کی ہے کہ بلوچ قومی تحریک ایک ایسے مرحلے میں ہے۔ جب ہر گلی کوچے میں بلوچوں کا خون بہہ رہا ہے۔ بے شمار لوگ غائب ہیں، اذیت گاہوں میں ظلم سہہ رہے ہیں، اکثر کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ زندہ ہیں یا اجتماعی قبرستانوں میں پھینک دیئے گئے ہیں؟ ٹارگٹ کلنگ کا سلسلہ جاری ہے۔ قبائلی جھگڑوں کے نام پر بلوچ معاشرے کو منظم ٹکڑوں میں تقسیم کیا جارہا ہے۔ ہر جانب آگ لگی ہوئی ہے۔ لاکھوں افراد فوج کشی کے باعث اپنے گھر بار چھوڑ چکے ہیں۔ ایرانی خفیہ ایجنسی ساواک کی طرز پر ہر گھر میں مخبر پیدا کیئے جارہے ہیں۔ اس صورتحال میں بعض بلوچ حریت پسندوں کو الگ تھلگ کرنے اور Isolation کا شکار بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور یہ تضاد کا کھیل سوشل میڈیا پر کھیلا جارہا ہے۔ کیا یہ لوگ بلوچستان کی محبت کے جنون میں قابض ریاست کا کام آسان نہیں کررہے؟ کسی کے لیے ڈاکٹر اللہ نظر بلوچ قابل قبول نہیں۔ کسی کو نواب براہمدغ بگٹی پر اعتراض، نواب خیر بخش مری اور ان کے قابل قدر سپوتوں کے درمیان بھی اختلافات کے بیج بوئے جارہے ہیں۔ کیا یہ تحریک کا رومانس ہے۔ یا غیر ذمہ دارانہ حرکتیں ہیں؟

عام بلوچوں نے اپنی ساری توقعات حتیٰ کہ اپنی زندگیاں اور خاندان کی عزت و آبرو داؤ پر لگا رکھی ہے۔ وہ ان سوالات کو سننے اور ان سے پیدا ہونے والے اختلافات پر کبیدہ خاطر ہیں۔ ان کا مورال کمزور کیا جارہا ہے۔

نفسیاتی جنگ جو اس مرحلے میں بلوچ جیت چکے ہیں ۔ اب اس کو شکست میں تبدیل کرنے کیلئے ایسے شوشے کیوں چھوڑے جارہے ہیں۔ کوئی ذی شعور شخص یہ نہیں کہ لاکھوں موتوں کی قربانیوں کو نرگسیت اور مریضانہ ذہنیت کی نذر کیا جائے۔ لیکن ہر شہید کا بہتا ہوا لہو ہم سے ضرور پوچھ رہا ہے کہ ہم کیا کررہے ہیں؟ ہم کس حد تک ذمہ داری کا ثبوت دے رہے ہیں۔؟

ان تمام سوالات کو گہری نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے؟

اس امر سے انکار نہیں کہ طویل غلامی اور خاص طور پر پاکستانی سیاست کے اثرات سے اب تک ہم اپنا دامن نہیں چھڑا سکتے ہیں۔ وہی محلاتی سازشیں، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششیں، فتوی بازی سے سارے عناصر پاکستانی سیاست کے تانے بانے ہیں۔ یہ سب کچھ اب حریت پسندوں کے بعض نام نہاد نقادوں کا مرغوب کھیل بن چکا ہے۔ انٹرنیٹ پر بیٹھ کر اپنی مرضی کے اقتباسات چُن کر ان کو Paste کرکے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بلوچ قوم کی خدمت کررہے ہیں۔ اس کے نقصانات کیا ہونگے ؟ اس سے کسی کو غرض نہیں۔ المیہ یہ ہے کہ چند ایک مظاہروں میں شریک ہوکر یا انقلابی تنظیم کے ممبر ہونے کے ناطے وہ جلد ہی دانشوری کی بیماری میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ کتاب اور قلم کے ساتھ پر بھی تنقید کی جاتی ہے۔ اور جو سیاسی رہنماء آزادی کیلئے کتاب سے رہنمائی کی بات کرتے ہیں۔ ان کا کھلم کھلا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ کتابیں، انسان کا علم اور تجربات ہیں۔ جو ظلم، استحصال اور غلامی کے خلاف حریت پسندوں کو عمل پر مجبور کرتے ہیں۔

بلوچ سیاست کا المیہ رہا ہے کہ یہ ہمیشہ سے انتہاء پسندی کا شکار رہی ہے۔ ان میں ضرور مخلص لوگ بھی ہونگے ۔ لیکن اس سوچ نے بلوچ قوم کو بہت نقصان پہنچایا۔

مسلح جدوجہد کے حامیوں نے پختہ کار ذہنوں کے کتاب کی مخالفت کی۔ اور رد انقلابی عناصر نے بندوق کی جگہ کتاب کی رٹ لگائے رکھی۔ لیکن دونوں انتہائیں غلط ہیں۔ بلوچ قومی تحریک کیلئے جہاں جذبہ حریت کی ضرورت ہے۔ وہاں عقل اور سوچ کی ضرورت بھی ہے۔ تعقل پسندی کے بغیر صرف جذبات کے ذریعے قوم کو غلامی سے نجات نہیں دلائی جاسکتی۔ ہٹلر کو بھی اپنے وطن سے محبت تھی۔ لیکن جنون کی حد تک تھی۔ لیکن اس کی اس محبت نے کیا گُل کھلائے۔ صرف محبت کے اظہار سے قوم اور ملک کی خدمت نہیں ہوسکتی۔

اگر کسی کو دانش وری کا شوق ہے تو اس کی راہ کس نے رد کی ہے؟ اور اس راہ پر چلے اور قوم کو راستہ سمجھانے میں مدد دے۔ لیکن عقلی استدلال سے عاری ایک دوسرے کے خلاف الزامات کی بوچھاڑ ہمارے ذہنی پسماندگی کا ثبوت ہیں۔ وہ کام جو مخبر نہیں کرسکتے، آج وہی کام ہم اپنے ہاتھ سے سرانجام دے رہے ہیں۔ سوشل میڈیا کے ذریعے سوالات اٹھانے والوں پر بھی بہت سے سوالات اٹھ رہے ہیں؟ کیا وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ ان سوالات کا جواب دے سکیں؟ وطن سے دور رہ کر کنکر پھینکنا بڑا آسان ہے، اس سے نرگسیت کی تسکین ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کو وطن کی محبت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ بہتر یہ ہے کہ سوشل میڈیا پر الٹے سیدھے سوالات Paste کرنے اور کتاب کی مخالفت کے بجائے وہ اپنے سوالات کو تحریری شکل میں لائیں۔ یہ ایسے ہے کہ وہ کتاب کی مدد سے کتاب کی مخالفت کررہے ہیں۔ یقیناً جو بھی سوالات معاشرے میں اٹھتے ہیں۔ ان کا تعلق علمی تجربات اور مشاہدات سے ہوتا ہے۔ اگر آپ کیلئے یہ سب کچھ نہیں ہے تو کسی دوسرے کیلئے کیونکر غلط ہوسکتے ہیں۔؟ لہٰذا دانشور، سیاسی ورکر اور انقلابی مختلف کردار ہوتے ہیں۔ بہت کم ایسے عبقری ذہن ہونگے جو بیک وقت سیاسی رہبر اور عظیم دانشور ہوں۔ لہٰذا خود کو چوں چوں کا مربہ بنانے کے بجائے ایک مرکز پر توجہ دی جائے اور کام کیا جائے۔ صرف سوالات اٹھانے سے مسائل حل نہیں ہونگے۔ ان کے جوابات دینے کی بھی سعی کرنی چاہیئے۔ فتوٰی بازی اور خود کو افضل سمجھنے کا رویہ ترک کرنا ہوگا۔ سبھی قوم کی عدالت میں احتساب کیلئے تیار رہیں۔ اگر ایسے سوالات اٹھانے کی بات ہوتی۔ تو نواب خیر بخش مری سے بڑھ کر ایسی کونسی شخصیت ہوسکتی ہے۔ انہوں نے کبھی اپنی دانشوری کا زعم نہیں دکھایا۔ برے سے برے حالات میں بھی اپنے بدترین دشمنوں کے خلاف ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے لوگوں کی سوچ منتشر ہوجائے۔ لوگوں کو منتشر کرنے کے بجائے ان کی سوچ کو ایک مرکز پر لانا ہوگا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ انقلابی تنظیموں میں موقع پرستوں کی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے۔ ان کے قول وفعل اور کردار کا جائزہ ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ ایک شخص (Loud Speak) کرے اور اسے ہم اپنی ہمدرد اور دوست تسلیم کریں۔ ہمیں ہر قدم پر ہوشیار رہنا ہوگا۔

درباری ذہنیت کو اپنے بیچ میں سے نکالنا ہوگا۔ عوام اور بعض سیاسی شخصیات کی قربت کی خاطر قوم کے مفاد کو داؤ پر لگانے والوں سے دور رہنا ہوگا۔ بے شک ہماری تعداد کم ہو۔ اس سے فرق نہیں پڑتا۔ لیکن ایک بار موقع پرست ہمارے درمیان گھس بیٹھے، وہ اختلافات کو ضرور ہوا دیں گے۔ ایسے انسان کی تربیت کسی اور ماحول میں ہوئی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ لاکھوں بلوچوں کے خون اور جذبات کی بنیاد پر جس نرگسیت کی بنیاد ڈالی جارہی ہے۔ یہ تباہی کا باعث ہے۔ اسے روکنے کیلئے جہاں عمل موثر ہتھیار ہا ہے وہاں بہترین لٹریچر کی بھی ضرورت ہے۔ ذہنی عیاشی کے ذریعے قوم کی خدمت نہیں ہوسکتی۔ اس نکتہ کو ضرور سمجھنا چاہیئے کہ مختلف شخصیات اور گمنام انقلابی اپنا عمل اپنے موثر کردار کے ذریعے ثابت کررہے ہیں۔ چند موقع پرستوں کو یہ حق نہیں دینا چاہیئے کہ وہ الٹے سیدھے سوالات کے ذریعے، اپنی انا کی تسکین یا ردِعمل کے طور پر بلوچ قومی تحریک کے خلاف زہر پھیلائیں جن کی مقبولیت اور شہرت کا شوق ہے۔ ان پر کوئی پابندی نہیں وہ کوئی اور میدان بھی منتخب کرسکتے ہیں۔ موقع پرست اور سوشل میڈیا کے نادان دوستوں کو آخر کب تک سمجھانا پڑے گا کہ انقلاب اور آزادی کی جدوجہد صبح کا ناشتہ، دوپہر یا رات کی ضیافت نہیں ہے۔

''مظلوم اور استحصالی طبقوں کیلئے امن ہی جنگ ہے''

☆ ارون دھتی رائے ☆

طویل انقلابی جدوجہد کی علامت نیلسن منڈیلا رخصت ہوگئے

ترتیب وتدوین: علی شیر

جنوبی افریقہ کے پہلے سیاہ فام صدر اور ملک میں نسلی امتیاز جدوجہد کی علامت سمجھے جانے والے رہنما نیلسن منڈیلا 95 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ جنوبی افریقہ کے پہلے سیاہ فام صدر نیلسن منڈیلا کے انتقال پر لاکھوں جنوبی افریقی باشندوں کے علاوہ دنیا بھر کے عوام اور خواص نے افسوس کا اظہار کیا ہے منڈیلا کے پھیپھڑوں میں انفیکشن کی وجہ سے طویل عرصے سے زیر علاج تھے۔ انھوں نے جمعرات کی رات 5 دسمبر 2013 مقامی وقت کے مطابق نو بجے قریب اس دنیا کو خیر باد کہا ،منڈیلا کو رقص اور نغمے (وہ ایک عظیم انسان تھے،ان کا انتقال ہم سب کے لئے ایک صدمہ) گا کر اپنے قائد کو خراج عقیدت پیش کر رہے تھے۔ منڈیلا کے انتقال کے بعد ملک کے عوامی مقامات اور دنیا بھر میں جنوبی افریقی سفارت خانوں میں تعزیتی پیغامات درج کرنے کے لئے کتب رکودی گئیں،نیلسن منڈیلا کو بابائے جمہوری جنوبی افریقہ کہا جاتا ہے اور ان سے سوال کیا گیا کہ وہ کیا چاہیں گے کہ لوگ انہیں کس طرح یاد کریں تو منڈیلا کا جواب تھا کہ میں چاؤں گا کہ لوگ کہیں کہ ایک ایسا شخص تھا جس نے دنیا میں اپنا فرض نبھایا جنوبی افریقہ کے صدر جیکب رومانے ان کے انتقال کے بارے میں اعلان کرتے کہا کہ ہماری قوم ایک عظیم سپوت سے محروم ہوگئی ہے ان کی تدفین میں سرکاری اعزاز کے ساتھ کی گئی اور اس دوران قومی پرچم سرنگوں کیا گیا۔ صدر زومانے منڈیلا کو عظیم انسان قرار دیتے ہوئے کہا ہم ان میں وہ چیز دیکھتے ہیں جو ہم خود میں تلاش کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا میرے ہم وطنوں نیلسن منڈیلا نے ہمیں اکٹھا کیا ہے تا کہ ہم انہیں خیر باد کہہ سکیں۔ نیلسن منڈیلا 1918 میں کوسا زبان بولنے والے تھیمبو قبیلے میں پیدا ہوئے جو جنوبی افریقہ کے مشرقی حصّے میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں آباد ہے جبوبی افریقہ میں انہیں ان کا خاندانی نام مادیبا سے پکارتے تھے۔ ان کا پیدائشی نام رولیہلا ہلا تھا، جبکہ ان کے ایک استاد نے ان کا انگریزی نام نیلسن رکھا۔ جب نیلسن نو برس کے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ وہ تھیمبو شاہی خاندان کے مشیر تھے۔ والد کے انتقال کے بعد شاہی خاندان کے بادشاہ ''جونگن تابادلن دائبو'' نے نیلسن کو تھیمبو لوگوں کے قائم مقام مشیر کی سر پرستی میں دے دیا۔ نیلسن منڈیلا نے 1943 میں افریقن نیشنل کانگریس (اے این سی) میں شمولیت اختیار کی، پہلے وہ صرف ایک کارکن تھے تاہم بعد میں وہ اے این سی یوتھ لیگ کے بانی اور صدر رہے۔ واضح رہے سیاہ فام لوگوں کے حقوق کے لئے افریقن نیشنل کانگریس 1912 میں قائم ہوگئی تھی، بیسویں صدی کے بڑے حصّے تک جنوبی افریقہ دو طبقوں کی حکمرانی رہی ہے نیشنل پارٹی اور ڈچ ریفارم چرچ ان کا عقیدہ انجیل کی ایک مخصوص تفہیم پر مبنی تھا۔ یا یُوں کہہ لیجئے کہ وہ اپنے نسل پرستانہ فلسفے کا جواز انجیل میں سے نکالا کرتے تھے جس میں ان کے مطابق سفید فام قوم کو ''منتخب قوم'' کے درجے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ جبوبی افریقہ میں نسل پرست (Aparthied) کی تاریخ بہت پرانی ہے جب جنوبی افریہ میں یورپی حکمرانی کا آغاز ہوا اس کے ساتھ ہی نسل پرستی کا بھی آغاز ہوگیا تھا۔ 1948 سے پہلے تک جنوبی افریقہ میں ڈنڈے کے زور پر نسلی تعصب کی عملدار کی تھی۔ لیکن مسلّط کیا گیا۔ ان انتخابات میں صرف سفید فام افراد ہی کو ووٹ ڈالنے کی اجازت دی گئی تھی۔ ''قانونی لحاظ سے نسل پرستی کے تین بنیادی حصّے تھے نسلی درجہ بندی کا قانون جس میں ہر مشتبہ غیر یورپی شخص کو نسل کی بنیادی پر درجہ دیا گیا تھا دوغلی شادیوں کا قانون، جس میں مختلف نسلوں کے لوگواں کے درمیان شادی کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اگر وہ علاقوں کا قانون، جس میں مخصوص نسلوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو مقررہ علاقوں میں رہنے پر مجبور کر دیا گیا' نیلسن منڈیلا ابتداء میں پُر امن جدوجہد حامی تھے مگر جلد ہی انہیں محسوس ہوگیا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے نیلسن منڈیلا پر امن جدوجہد سے مسلح جدوجہد کی طرف کیوں گئے؟ اس موضوع پر آپ بنتی میں وہ لکھتے ہیں۔ ''میں نے بڑی نرم مزاجی سے وضاحت کی کہ ہمارے پاس مسلح جدوجہد کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ میں نے ایک پرانی ضرب المثل پیش کی کہ ''وحشی درندوں کے حملے کا مقابلہ آپ خالی ہاتھوں سے نہیں کر سکتے'' افریکن نیشنل کانگریس ایک قانونی تنظیم تھی اب لوگ از خود مسلح گروہ تشکیل دے رہے تھے اور صرف اے این سی ہی ان کی قیادت کرنے کی اہل تھی۔ ہم نے ہمیشہ اس بات پر یقین کیا کہ وام ہم سے زیادہ ترقی پسند تھے اور اب تو انہوں نے یہ ثابت کر دیا تھا 1949 میں سفید فام قوموں کے قبضہ کو ختم کرنے کے لئے بائیکاٹ، سول نافرمانی اور عدم تعاون کا اعلان کیا گیا۔ اسی وقت افریقن نیشنل کانگریس میں نئی قیادت ابھر کر سامنے آئی۔ اسی دوران

منڈیلا پارٹی کی قومی ایگزیکٹیوں کمیٹی میں شامل ہوئے۔گذشتہ صدی کے پانچویں دہائی کی ابتداء میں نیلسن منڈیلا نے افریقن نیشنل کانگریس کی ایک مہم کے تحت مکمل بھر کا دورہ کیا اس سفر میں حکومت نے ''کمیونزم مخالف قانون'' کا استعمال کرتے ہوئے منڈیلا نے افریقن نیشنل کانگریس کے لئے ایک نئی منصوبہ بندی تیار کی جسے ایم پلان کا نام دیا گیا۔سال 1955 میں منڈیلا نے افریقن نیشنل کانگریس کا ''فریڈم چارٹر'' لکھا۔جس میں انہوں نے قرار دیا کہ ''جنوبی افریقہ ان تمام افراد کا ہے جو یہاں رہتے ہیں۔سیاہ فام اور سفید فام اور کوئی بھی حکومت اقتدار کے حق کا اس وقت تک دعوٰی نہیں کرسکتی جب تک وہ جنوبی افریقہ کے تمام لوگوں کی مرضی سے تشکیل نہ دی گئی ہو' منڈیلا نے وکالت پڑھی اور 1952 میں اپنے ساتھی اولیور تیمبو کے ساتھ مل کر جوہانسگ میں دفتر کھول کر پریکٹس شروع کی ۔منڈیلا نے اپنے دوست ساتھ مل کر نسل پرستی کے اس نظام کے خلاف مہم چلائی جسے سفید فام افراد پر مشتمل جماعت نیشنل پارٹی نے واضح کیا تھا اور جس سے سیاہ فام اکثریت کا استحصال ہورہا تھا 1956 میں منڈیلا اور 155 دیگر کارکنوں پر فریڈم چارٹر کی حمایت پر غداری کا الزام عائد کر کے چار سال تک مقدمہ چلایا گیا نسل پرستی کے خلاف مزاحمت اس وقت بڑھی جب ملک میں ایک نیا قانون بنا ۔1958 میں نافاالعمل ہونے والے اس قانون کے تحت سیاہ فام اور مخلوط نسل کے لوگوں کو رہائش اور روزگار سے متعلق ہدایات تھیں اور ان لوگوں کو کچھ جگہوں پر جانے سے روکتا تھا۔دوسال بعد اس قانون کے خلاف مظاہرے کے دوران لوگوں پر گولیاں چلائی گئیں جس سے 69 افراد ہلاک ہوگئے۔یہ واقعہ ''شارپولے قتل'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس واقعہ کے 9 دن بعد حکومت نے فریقن نیشنل کانگریس پر پابندی لگاتے ہوئے ایمرجنسی نافذ کردیا اور نیلسن منڈیلا سمیت ہزاروں سیاسی کارکنوں کو بغیر مقدمہ چلائے جیل بھیج دیا گیا۔شارپولے قتل واقعہ جنوبی افریقہ میں پرامن مزاحمت کے مکمل خاتمے کا باعث بنا۔اس وقت اے این سی کی نائب صدر منڈیلا نے ملکی معیشت کی سبوتاژ کی مہم چلادی تھی۔ریوونیا کے کمرہ عدالت میں خود اپنا دفاع کرتے ہوئے منڈیلا نے جمہوریت آزای اور برابری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔انہوں نے کہا کہ ''میں ایک مثالی جمہوریت اور آزاد معاشرے کا خواہش مند ہوں جس میں تمام لوگ ایک ساتھ امن سے زندگی بسر کریں اور انہیں ایک جیسے مواقع میّسر ہوں۔یہ میرا تصّور ہے جس کو مکمل کرنے کے لئے میں زندہ ہوں۔لیکن اگر ضرورت پڑی تو اس کی خاطر مرنے کے لئے بھی تیار ہوں 1964 کے موسم سرما میں انہیں عمر قید کی سزا سنادی گئی۔1968 اور 1969 کے بارہ ماہ کے دوران منڈیلا کی والدہ کا انتقال ہوا اور ان کا بڑا بیٹا کا حادثے میں ہلاک ہوگیا۔لیکن انہیں ان کی آخری رسومات میں شرکت کی اجازت نہیں دی گئی۔انہیں اٹھارہ (18) برس تک جزیرہ رابن کی جیل میں قید رکھا گیا اور بھر 1982 میں اولیور تیمبو نے منڈیلا کو رہا کروانے کے لئے بین الاقوامی مہم کا آغاز کیا حالانکہ وہ خود جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔بین الاقوامی برادری نے جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کے خلاف 1966 میں لگائی جانے والی پابندیوں کو مزید سخت کردیا۔اس دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1990 میں جنوبی افریقہ کے صدر ایف ڈبلیو ڈی کلارک نے اے این سی پر عائد پابندی ختم کر دی اور منڈیلا کو بھی رہا کردیا (اس کے بعد جنوبی افریقہ میں ایک نئی مختلف النسل جمہوریت کے قیام کے لئے بات چیت شروع ہوئی) 11 فروری 1990 میں رہائی فوری بعد منڈیلا نے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''میں آپ لوگوں کے سامنے ایک نبی کے طور پر نہیں بلکہ منکسر المزاج خادم کے طور پر کھڑا ہوں۔آپ لوگوں کی انتھک کوششوں اور بہادرانہ قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ میں یہاں موجود ہوں اور اپنی زندگی کے بقیہ سال آپ کے ہاتھوں میں دے رہا ہوں'' منڈیلا جدید دنیا کے قابلِ احترام حکمرانوں میں سے ایک تھا۔انہوں نے جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کو مختلف النسل جمہوریت میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کی قیادت کی ۔منڈیلا نے 1992 میں اپنی ایک بیوی ونی کو اغواء اور تشدد کے الزامت میں سزا ملنے کے بعد جنوبی افریقی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قید کاٹنے کے بعد ملک کے پہلے سیاہ فام صدر اکثریت سے منتخب ہوئے۔انہیں اپنے اقتدار میں جو سب سے بڑے مسائل درپیش رہے ان میں غریب افراد کے لئے گھروں کی کمی اور شہروں میں پھیلتی ہوئی کچی آبادی تھیں۔انہوں نے حکومتی معاملات اپنے نائب تھابو میبکی کو سونپے اور خود جنوبی افریقہ کی نئی بین الاقوامی ساکھ کا بنانے میں مصروف ہوگئے۔وہ ملک میں موجود بین الاقوامی اداروں کو وہیں رہنے اور سرمایہ کاری کیلئے قائل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور دنیا کے دورے جاری رکھے اہم رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور کانفرنسوں میں شرکت کی۔انہوں نے جنگ زدہ علاقوں میں قیام امن کے لئے کلیدکردار ادا کیا۔

مئی 1994 میں جنوبی افریقہ کے پہلے سیاہ فام صدر منتخب ہونے کے چند ہفتوں کے اندر اندر ان کی سیاسی بصیرت دنیا بھر پر عیاں ہونے لگی تھی۔انہوں نے اس

موقع پر اپنے ہم وطنوں سے کہا تھا ''وہ دنیا اور خود اپنے آپ کیلئے امن کی قوس قزح بن کر دکھائیں'' جنوبی افریقہ کی معیشت پر غالب سفید فام کاروبار نے عمومی طور پر منیلا کے تعمیر نو اور ترقی کے اس پروگرام کو خوش آمدید کہا جسے انہوں نے پارلیمان میں پیش کیا تھا۔انہوں نے جنوبی افریقہ کی ایسی تنظیم کا رُوپ میں ڈھال لیں جو ملک کی معاشی کامیابی کیلئے کام کرے۔اس کے علاوہ کنزرویٹیو پارٹی کی رہنما ہارٹسن برگ سے اور جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کے خالق ہنڈرک کی ضرورت کی بیوہ نیٹی سے بھی ملاقاتیں کیں۔منڈیلا کے عالمی سیاسی مدبر ہونے کی شہرت بھی کسی سے کم نہیں۔تاہم دنیا بھر کے مشاہیر کے شاتھ میل جول اور ہر جگہ سے عزت پانے کے باوجود ان کے اندر سیاسی تڑپ برقرار تھی۔منڈیلا دنیا بھر کے ہر دلعزیز سیاستدان تھے۔اس کی تصدیق ان کو ملنے والی انعامت ،ایک سو سے زائد اعزازی ڈگریاں جن میں نوبل برائے امن سمیت بصات میں جواہر لعل نہرو ایوارڈ،گلاسکو میں فریڈم آف سٹی ایوارڈ ،ویانا میں برونو کرسی ایوارڈ ،جرمنی میں آرڈر آف اسٹار ایوارڈ ،یونیسکو نے پہلے سالمئن بولیور ایوارڈ ،اور کیوبا میں فیڈل کاسترو کے دیئے گئے پلایا گیرون ایوارڈ شامل ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ دنیا بڑی تعداد میں ان کے نام پر رکھے گئے سڑکوں چوکوں اور عمارتوں کے نام ان کی شہرت کے آئینہ دار ہیں۔منڈیلا بیسویں صدی کے آخری عشروں میں لبرل ازم کی علامت تھے۔عالمی رہنماؤں اور مائیکل جیکسن،ڈیوڈ بیکہم ،سپائس گرلز جیسی مشہور شخصیات ان کے ساتھ دیکھے جانے کی متمنی ہوا کرتی تھیں۔وہ زبردست زہانت اور رابطہ کاری کے ہنر کی مدد سے مثالیت اور حقیقت پسندی کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنا جانتے تھے۔دوران جیل نیلسن منڈیلا کو سفید فام حکومت اور عالمی سامراجی لیڈر ''دہشتگری'' کہتے تھے،کیونکہ انہوں نے مسلح جدوجہد بھی کی تھی۔آج نیلسن منڈیلا کے گن گانے اور ان کی وفات پر مگر مچھ کے آنسو بہانے والے سامراجی لیڈر ان دنوں منڈیلا کے خلاف شدید زہر اُگل رہے تھے۔رونلڈ ریگن اور مارگریٹ تھیچر کی منڈیلا سے نفرت اور دہائی میں حقارت کی کوئی انتہا نہ تھی۔برطانیہ کی ٹوری پارٹی کے یوتھ ونگ ''ینگ ٹوریز'' نے 1980 کی دہائی میں ایک پوسٹر چھاپا تھا ،جس پر لکھا تھا ''منڈیلا کو پھانسی دو'' آج کے برطانوی وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون ان دنوں اس تنظیم متحرک ممبر تھے۔پھر وہ وقت بھی آیا جب لندن میں پارلیمنٹ اور ویسٹ منسٹر قریب نیلسن منڈیلا کا مجسمہ نصب کیا گیا۔واضح رہے کہ اسی میدان میں سر ونسٹن چرچل کا بُت بھی نصب ہے،گو کہ نیلسن منڈیلا کا مجسمہ چرچل کے مجسمے کے مقابلے میں چھوٹا ہے،لیکن اگر ان کی جدوجہد کے حوالے سے دیکھا جائے تو پھر منڈیلا کی ایک ایسی انفرادیت نظر آئے گی،جو انہیں ہر ایک سے ممتاز کرتی ہے۔منڈیلا نے جنوبی افریقہ کی سفید فام اقلیت کو شکست دینے کے بعد ان سے دریا دلی کے مظاہرے کے باعث دنیا کو ششدر کر دیا تھا۔اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک وہ افریقہ بھر میں امن اور مفاہمت کے غیر متزلزل عزم پر ثابت قدم رہے۔انہوں نے سفید فام جنگجوؤں کی زولو قوم کے ساتھ جنگ میں صلح کا کردار ادا کیا تھا۔لیکن وہ شخص جسے ایک نسل کے برابر مدت تک پابند سلاسل رکھا گیا تھا۔وہ عالمی اسٹیج پر زیادہ آب وتاب سے چمکا۔انہوں نے دنیا بھر کے دورے کئے جن کے دوران بڑے بڑے ہجوم ان کا استقبال کیا کرتے تھے۔منڈیلا ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے جنہوں نے افریقن نیشنل کانگریس کی حمایت کی تھی اس ضمن میں انہوں نے کیوبا کا دورہ کر کے فیڈل کاسترو سے ملاقات کی وہ ست کے لئے نرم خو اور مسحور کن تھے۔ان کی ایک وجہ شہرت وقت کی پابندی بھی تھی۔وہ ممکنہ پریشان کن موقعوں سے بھی صفائی سے نمٹ لیتے تھے،جس کا ایک ثبوت 1990 میں مارگریٹ تھیچر سے ان کی ملاقات ہے۔صدارت سے اپنی باقاعدہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ زیادہ تر عوامی اجتماعات میں اپنے فلاحی ادارے ''منڈیلا فاؤنڈیشن'' کے لئے کام کی غرض سے نظر آتے تھے۔منڈیلا نے اپنی 89 سالگرہ پر دنیا کی نمایاں شخصیات پر مشتمل ایک گروپ ''دی ایلڈرز'' قائم کیا۔تاکہ دنیا میں درپیش مشکل ترین مسائل سے نمٹنے کے لئے ان افراد کی مہارت اور رہنمائی حاصل کی جاسکے۔انہوں نے حالیہ برسوں میں سب سے بڑا کام جو کیا وہ 2005 میں ان کے بیٹے ماگاتھو کی موت پر تھا۔منڈیلا نے اعلان کیا کہ ان کے بیٹے کی موت ایڈز کی وجہ سے ہوئی اور جنوبی افریقہ کے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ ایڈز کے بارے میں اس طرح سے بات کریں کہ اس عام بیماری کی طرح سمجھا جائے۔انہوں نے HIV ایڈز کے خلاف مہم چلا ئی اور اپنے ملک کو 2010 کے فٹ بال ورلڈکپ کی میزبانی دلوانے میں اہم کردار ادا کیا۔2001 میں نیلسن منڈیلا میں مثانے کے غدود کے کینسر کی تشخیص ہوئی لیکن افریقی اتحاد کی تنظیم جسے اب افریقی یونین کہا جاتا ہے کے تحت منڈیلا نے کئی افریقی تنازعات میں صلح گر کا کردار ادا کیا۔ان میں انگولا برونڈی اور کانگو کے تنازعات شامل ہیں انہوں نے دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی امن کی کوششوں کی حوصلہ افزائی کی،تاہم انہیں محدود کامیابی ملی۔2004 میں 85 برس کی عمر میں انہوں نے عوامی زندگی سے ریٹائرمنٹ لی تاکہ وہ اپنے خاندان والوں اور دوستوں کے ساتھ زیادہ وقت گزار سکیں۔وہ 2003 میں عراق پر امریکی حملے کے سرگرم مخالف تھے انہوں نے امریکہ کے سابق صدر بش سینئر کو فون کر کے کہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو جنگ سے باز رکھیں اور میں ایسی طاقت کی مذمت کرتا ہوں جس کا صدر دوراندیشی کی صلاحیت سے عاری ہے۔جو صحیح طریقے سے سوچ نہیں سکتا اور جو دنیا کو تباہی میں جھونکنے پر تُلا ہوا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تاریکی سے تاریکی کو ختم نہیں کیا جاسکتا

خالد سعید

اگر ہم انسانی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ بات واضح طور پر معلوم ہوگا کہ انسان اپنی خواہشات کے لیئے آخری حد تک جاسکتی ہے اور انسان ہی اپنی تمام ذاتی خواہشات کی قربانی دہ سکتی ہے۔ اگر ہم باریک بینی سے دیکھیں تو ہمیں ایسے لاکھوں انسان ملیں گے جو ایک خوشحال اور پرامن دنیا کے لیئے اپنی تمام ذاتی خواہشات کی قربانی دینے کو تیار ہیں اور کروڑوں ایسے انسان بھی ملیں گے جو صرف اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیئے کچھ بھی کرسکتی ہیں اپنی ذات کو ایک عظیم مقصد کے لیئے قربان کرنے والے کو انقلابی اور اپنی خواہشات کے لیئے ایک عظیم مقصد کو قربان کرنے والے کو مطلبی کہتے ہیں۔

انقلابی اندھیری راہوں سے ہوکر روشنی میں سفر کرتی ہے اور مطلبی روشنی میں رہ کر بھی اندھیری گلیوں میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔ طاقت اکثر اوقات بلکہ ہر وقت مطلبی لوگوں کے پاس ہوتی ہے کیونکہ بیشتر لوگ مطلبی ہوتے ہیں۔ ہزاروں یا لاکھوں لوگوں میں صرف چند انقلابی پیدا ہوتے ہیں۔ اور صرف وہی چند انقلابی اپنی زانت، شعور، مخلصی، ایمانداری، محنت اور مستقل مزاجی کو سیڑھی بنا کر لاکھوں مطلبی لوگوں کو انقلابی بنا کر انقلاب یا روشنی کے علامت بن جاتے ہیں۔ سچائی انقلابی کی دین ہوتی ہے، یہ قدرت کا اٹل قانون ہے کہ سچائی کو چاہے جتنا بھی مسخ کیا جائے اور سچائی کی راہیں چاہے جتنی بھی تکلیف اور مصیبتوں سے بھری ہوئی ہوں آخر میں جیت سچائی کی ہی ہوتی ہے۔ اور ایک انسان تب انقلابی بنتا ہے جب وہ سچا ہو۔

''ایک جگنو بھی اڑ رہا ہو اگر
رات جتنی رکاوٹیں ڈالے
روشنی کا سفر کبھی نہیں روکتا''

تاریکی کو ہمیشہ روشنی ہی ختم کرسکتی ہے اور تاریکی اس وقت آتی ہے جب روشنی ڈوب جاتی ہے۔ انسانی تاریخی میں ہزاروں ایسی داستانیں، حقیقتیں ہمیں ملیں گی کہ قوموں نے تاریکی (غلامی) سے تنگ آکر روشنی (آزادی) کے لیئے ذاتی مفادات سے بالاتر ہوکر ہر اس چیز کو قربان کردیا جو تاریکی (غلامی) کی سبب تھی۔ جہد بلوچ، آزادی بلوچستان کی آواز نے اس وقت سر اٹھائی جب لاکھوں مطلبی اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیئے سچائی کو زندہ دفن کرنے کی جستجو میں لگے ہوئے تھے۔ جب مطلبی اپنی ذاتی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیئے حد سے گزر جاتے ہیں تو وہاں ایک انقلابی کا پیدا ہونا اور انقلاب لانا فطری قانون ہوتا ہے۔

بلوچ قوم کی آزادی کو مسخ کرنا، اسکی زمین پر قبضہ جمانا، اسکی شناخت اور وجود کو داؤ پر لگانا، اسکی ذہنی صلاحیتوں کو غلام بنانا اور اس تخلیقی آواز اور سوچ کو ختم کرنا جو سچائی سے واقفیت رکھتی ہو، ان ناجائز ایکشنز پر بلوچ قوم کا ری ایکشن یا شعوری ایکشن جائز، قانونی اور فطری اور اسکو برقرار رکھنا ایک سچائی حقیقت اور روشی ہے۔ جتنی ذ انت، قوت اور حکمت عملی انقلاب لانے کے لیئے درکار ہوتی ہے، اس سے کئی گناہ ذانت، قوت حکمت عملی اور حساسیت انقلاب برقرار اور اسکو منزل تک سر کرنے کے لیئے درکار ہوتی ہیں۔

تاریکی کو ختم کرنے کے لیئے روشنی کی لہریں پیدا ہوچکی ہیں، ظلم کے خلاف مظلوم کی آواز نے سر اٹھایا ہے، آزادی، انقلاب، سچائی کے لیئے بلوچ قوم کے عظیم فرزند اپنی ذاتی خواہشاتوں سے بالاتر ہوکر عظیم مقصد کے لیئے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوچکے ہیں۔ عارضی خواہشیں دم توڑ رہی ہیں۔ بلوچ عوام کے دلوں میں سچائی اور روشنی کا جذبہ پیدا ہوچکا ہے۔ بچے بچے میں آزادی کی تڑپ اور قبضہ گیریت کے لیئے نفرت پیدا ہوچکا ہے۔ بلوچ راج کے کئی فرزند نئی ابھرتی ہوئی سورج کے لیئے ٹارچر سیلوں میں ہماری سوچ سے کئی گناہ تشدد کے باوجود پختگی اور شعوری بنیادوں پر صبح نور کے لیئے تڑپ رہی ہیں۔ معاشرتی اور دنیا کے خواہشات سے دور بلوچ قوم کے نوجوان بہادری حوصلہ، فخر اور جوان مردی سے قابض دشمن سے مسلح جدوجہد میں مگن، برداشت سے بھی باہر مصیبتوں اور تکلیفوں کو ذہنی طور پر سہہ رہے ہیں۔

ہر طبقہ بلوچ نے آزادی کی جنگ کو تسلیم اور آزادی کے لیئے قربانی کے تقاضوں کو قبول کرلیا ہے۔ لیکن اب ہمیں روشن راستوں پر آگے بڑھنا ہے یا اندھیروں میں؟؟؟ اسکا تعین اب ہمارے ''لیڈرشپ'' پر ہے۔

''اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ جس دیئے میں جان ہوگی وہی جلتا رہے گا

لیڈرشپ۔۔۔ چند لمحوں کے لیے ٹھہرو، دیکھو سوچو سمجھو۔۔۔ آزاد کردو اپنے آپکو تمام تنظیمی، ذاتی، خونی اور فکری رشتوں سے۔۔۔ خالی پن کی کیفیت میں آؤ

مطلب کچھ بھی نہیں آپکے ذہن میں، ایک سادہ پیپر۔۔۔اب فیصلہ کروکہ۔
آہے بلوچ راج کا حقیقی لیڈر جسکی آواز پر پوری قوم لبیک کرتی ہو جوالف سے ی تک انا پرستی، گروہیت، بناوٹی ہیروازم سے آزاد ہو؟ جس نے بلوچ راجی جہد کے کسی بھی مسلح یا پرپٹیکل تنظیم کو ایک ادارے کی حیثیت دی ہو۔۔۔!
وہ ادارہ جو پوری قوم کی نمائندگی کرتی ہو جہاں راج کے چھوٹے چھوٹے مسئلوں سے لیکر بڑے بڑے مسائل کے حل کرنے کا طریقہ موجود ہو یا ان کے پاس اتنی صلاحیت یا اختیار ہو ان مسئلوں کو حل کرنے کا۔۔۔۔!
ہے آپ میں کوئی ماؤزتنگ، فیڈرل کاسترو، چے گویرا، ہوچی منہ، نیلسن منڈیلا، مارٹن لوتھر کنگ جو عاجزی، نظم مضبط، علم، زانت اعتماد، یقین، شعوری عمل اور سچائی وطن کی آزادی بلوچ، بلوچ شہیدوں اور اسیران کی مشن کو منزل کی طرف ولولہ اور کامل جذبہ کے ساتھ جاری رکھیں؟؟؟
جسکو حساسیت سے احساس ہو کہ آج پوری بلوچ قوم حالات جنگ میں ہے؟؟؟
بلوچ راج کے سب فرزند اس جنگ میں متاثر ہیں اور بلوچ قوم کی اب بس یہی آخری امید ہے؟؟؟
کسی میں یہ احساس بلوچ راج نوجوان مرد، عورت، مائیں، بہنیں کس امید پہ اپنی آج کو کل کے لیئے قربان کررہی ہے؟؟؟
بلوچ راج کے فرزند سب کچھ داؤ پہ لگا کر جنگ آزادی میں کود کر سب کچھ قربان کررہے ہیں آہے کسی کو احساس ہے کہ کیوں؟؟؟
آپ میں کوئی جو یہ سوچتا ہو محدود سوچ، خودغرضی آزاد خیالی، جھوٹ، منافقت، ذاتی رشتہ داری و دوستی، گروہیت، انا پرستی، شخصیت پرستی پوری قوم کو غرق دریا کرسکتی ہے ؟؟؟
آپ میں کوئی جو پوری قوم کو یہ سمجھا سکے کہ کہاں سے ہم نے شروع کی تھی؟
کدھر ہمیں جانا ہے؟؟ ابھی ہم کہاں ہیں؟؟ کس طرف جارہے ہیں؟؟ اور ہماری آخری منزل کہاں تک ہے؟؟
آپ ''خود'' دیکھو۔۔۔سوچو۔۔۔سمجھو اور فیصلہ کرو ایسا نہ ہو کہ کل آزادی کی جنگ کی تباہی کی ایک ذمہ دار آپکی خاموشی ہو۔
''ابھی پائی ہے رہائی رہزن سے
بھٹک نہ جاؤں رہنما کی بات نہ کر۔۔
اس سے پہلے ہی کوئی بحران ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے آن دبوچ بلوچ لیڈرشپ کو وقت و حالات کے تقاضوں کے عین مطابق سمجھداری بہترین حکمت عملوں اور پالیسیوں سے قوم کو اتحاد بھروسہ اور منظم تشکیل نو کی طرف لے جانا چاہیئے۔ کیونکہ نابلدی اور وقت و حالات کے تقاضوں کے برخلاف پالیسیوں کی وجہ سے قابض ریاست سے زیادہ تحریک اور تنظیم کو ہم نے خود نقصان پہنچایا ہے۔ آج بلوچ سیاسی قیادت اور بلوچ دفاعی تنظیمیں قدیم طرز عمل وفکر کے شکار ہیں۔
آج بلوچ کی جنگ سے زیادہ کریڈٹ کی جنگ کو ہم زیادہ دیکھ اور محسوس کررہے ہیں۔ کاش کے یہ صرف میرے دیکھنے اور محسوس کرنے کی حد تک ہوتا لیکن افسوس آج پوری قوم اس ناسور عمل کو دیکھ اور محسوس کررہا ہے۔
کل جو آنکھوں کی چمک اور دل کی دھڑکن میرے تھے اور آج دہشت گرد جیسے لفظوں سے پکارے ہیں۔ جو پوری قوم اور دفاعی تنظیموں کے لیئے سوالیہ نشان اور سوچنے کی بات ہے۔
ہمیں کسی مسیحا کی انتظار نہیں بلکہ اپنی سوچ اور خود کو تبدیل کرنا ہوگا۔ بلوچ کی سیاسی قوت اور دفاعی قوت کو وقت کے نت نئے چیلنجوں کا مقابلہ اور قابض ریاست اور انکے گماشتوں کو شکست دینے کے لیئے ماضی سے نکل کر نئی طرز عمل وفکر کے ساتھ خود کو نئے پیمانوں میں ڈھالنا ہوگا۔ لفاظی اور تحریروں کی حد تک نہیں عملی ہو کر انتشار اور مایوسی کے فضاء کو ختم کرنا وقت و حالات کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ کیونکہ کل ایسا نہ ہو کہ ''ہماری داستان تک نہ ہو داستانوں میں'' آج کے ان نازک انقلابی اور جنگی حالات میں بلوچ لیڈرشپ کو داخلی اور خارجی دونوں حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے تاریخ ساز فیصلے کرنے ہونگے جو قومی اتحاد و اتفاق کی طرف مثبت قدم ہوں۔ کیونکہ بہت سے غلط اور بے وقت فیصلوں کی وجہ سے قومی انتشار کے بہت سے منفی اثرات سر اٹھا رہے ہیں۔ آج ہم ایک جسم بھی اپنی ڈیڑھ انچ کی مسجد بنا کر اس میں رہ رہے ہیں۔ جو قومی بقاء کے لیئے سوالیہ نشان ہے۔
بعض اوقات ہماری لیڈرشپ بغیر حقائق دلائل اور تحقیق کے اپنی ذاتی سوچ اور رائے کو عوامی سوچ سمجھ کر بہت غلط فیصلے کررہا ہے۔ آج عوامی سوچ کچھ اور لیڈر شپ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ ہم عوامی جنگ اور اپنے عوام کے لیئے جنگ لڑرہے ہیں۔ اس لیئے لیڈرشپ کو اپنی ذاتی فیصلوں اور اپنی ذات کو قربان کرنا ہوگا۔ عوامی رائے اور عوامی فیصلوں مدنظر رکھتے ہوئے فیصلے کرنے ہوں گے۔ کیونکہ ہم نے ان تقاضوں کو سنا بہت ہے۔
''اگر گوریلا جنگ عوام کی ہمدردیوں اور تعاون سے محرومی ہو جائے تو وہ باقی رہ سکتی ہے اور نہ ہی جاری رکھی جاسکتی ہے''۔
اور پھل اور پھول حاصل کرنے کے لیئے خاموشی اور انتظار بہت ضروری ہے۔

'' مٹا دیئے اپنی ھستی کو گو کچھ مرتبہ جاھیے
کہ دانہ خاك میں ملکر گل گلزار بنتا ھے''

تاریخ اور نسل پرستی

تحقیق: قندیل بلوچ

قدیم عہد میں یونانیوں اور رومیوں کا منطقی طور پر یہ سوچنے کا انداز صحیح تھا۔ وہ اس طرح سے سوچتے تھے کہ ایرانیوں' مصریوں' لیکٹوں اور جرمنوں کی شکل وشباہت اور جسمانی خصوصیات فطری اور پیدائشی طور پر ان بالکل مختلف ہیں اس لئے ان کے کردار میں بڑا فرق ہے۔ افلاطون اور ارسطو نے یونانیوں کی فطری برتری کے دعوی کی تصدیق کرتے ہوئے اس کا اظہار کیا کہ وہ وحشیوں سے افضل ہیں۔ ارسطو کا یہ نظریہ کہ کچھ لوگ فطرت کی جانب سے غلام پیدا کئے جاتے ہیں تا کہ وہ یونانیو ں کی خدمت کرسکیں اس نظریہ کی عکاسی کرتا ہے۔

یہودیوں کی قومی تاریخ میں' یہودیوں کو خدا کی پسندیدہ مخلوق کا درجہ اس لئے ملا کہ خدا اور ابراہیم اور اس کی اولاد میں ایک ابدی معاہدہ ہو چکا ہے' اس کے تحت برتری کے اوصاف اور خصوصیات۔ یہودی والدین کی جانب سے ان کے بچوں میں بطور وراثت آجاتی ہیں اور وہ مستقل طور پر اعلی وافضل رہتے ہیں۔

مغرب میں موجودہ نسل پرستی کے جو نظریات آتے ہیں ان کی جڑیں دو تاریخی خیالا ت میں ہیں اول کہ یونانیوں اور رومیوں کو فطرت نے برتر بنایا اور دوم نظریہ کہ یہ بر تری یہودیوں کو خدا کی جانب سے ملی۔ جب پندرہویں صدی میں یورپی اقوام کا تعلق افریقہ' ہندوستان اور امریکہ کے باشندوں سے ہوا تو انہوں نے ان نظریات کو وہاں پر اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے استعمال کیا اور اس طرح سے بائبل کے ماننے والے عیسائیوں نے خدا کے احکامات کی پیروی کرتے ہوئے' وعدہ کی ہوئی زمین پر قبضہ کیا اور انہوں نے غیر یورپی باشندوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو کہ۔ یہودیوں نے فلسطین کے کنعانی باشندوں کے ساتھ کیا تھا اور انہیں لکڑی جمع کرنے اور پانی بھرنے والوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ جب یورپیوں میں یہ نظریہ جڑ پکڑ گیا تو پھر ان کے ضمیر کو اس سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی کہ جب انہوں نے امریکہ کے قدیم باشندوں کا قتل عام کیا اور افریقہ کے سیاہ فام باشندوں کو وہا ں غلام بنا کر لے آئے۔

نسل کے بارے میں یہ مبہم نظریات اور مفروضے اٹھارویں صدی میں نشو ونما پا کر اور زیادہ طاقت ور ہوئے۔ ہرڈر نے اس بات پر زور دیا کہ نسلی کردار ایک مستقل خصوصیات ہے اور یہ ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اس کا جملہ ہے کہ ''چین کا آدمی ہمیشہ چینی رہتا ہے'' فرانسیسی انقلاب اور جرمنی' فرانس' اور برطانیہ کی رومانوی تحریکوں اور انقلاب کے نعروں' آزادی' مساوات اور اخوت کے جواب میں نسل پرستوں نے جن نظریات پر زور دیا وہ یہ تھے کہ ہر قوم تاریخی طور پر جداگانہ کردار کی حامل ہوتی ہے۔ اور اس وجہ سے ان کے سیاسی ادارے' سماجی عادات وروایات دوسروں سے علیحدہ ہوتی ہیں۔ اس طرح سے وہ یورپی اقوام کی علیحدگی اور ان کے اداروں کی بر تری کو ان کے کردار کی خوبیوں سے متعلق کرنا چاہتے تھے۔

جن مورخہ نے ان افکار کو تاریخ نویسی میں داخل کیا۔ انہوں نے بڑی سادگی سے مختلف زبانیں بولنے والے گروپوں کو'' قومیتوں'' کے نام سے پکارا اور یہ ثابت کیا کہ یہ قومیتیں اپنی خصوصیات کی بنہ پر پوری تاریخ میں علیحدہ خودمختار ہیں اور اس طر ح سے انہوں نے تاریخ کو اثر انداز کیا یہ تحریک دراصل فرانسیسی انقلاب اور نپولین جنگوں کے نتیجے میں قوم پرستی شکل میں وجود میں آئی اور بعد میں اسے سائنسی بنیا دوں پر شکل دینے کے لئے نئے ابھرتے ہوئے علم بشریات اور ڈارون کے علم حیو انیات سے مضبوط بنایا گیا۔

علم حیوانیات جانوروں میں سب سے زیادہ باشعور جانور انسان ہے اور یہ جانو روں کی دوسری اقسام کی طرح سے کئی قسم کی نسلوں میں تقسیم ہے اور یہ تقسیم مستقل اور نہ تبدیل ہونے والی ہے۔ اس تقسیم کو زبان' رنگ اور قد ایک مستقل حیثیت دیتا ہے۔ اس بات پر سب متفق تھے کہ جسمانی ساخت وحیثیت ایک نسل کو بناتی ہے۔

اس زمانہ میں ایک فرانسیسی کومے واگوبینا نے نورڈک نسل کا نظریہ پیش کیا جس کے تحت لمبے قد اور سنہری بالوں والی نسل کے لوگ یورپی اقوام میں سب سے زیادہ با عمل اور تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ایک اور فرانسیسی والا پوژ نے آریہ نسل کی برتری کا نظریہ پیش کیا جسے بعد میں اختیار کیا گیا اور ماہر لسانیات' علم حیوانیا ت' آثار قدیمہ مورخوں اور صحافیوں نے اسے مقبول بنانے میں مدد دی۔

ہٹلر کے زمانہ میں اس نظریہ کو اس کے وزیر فیرک نے اسکول نصاب میں داخل کیا۔ اس نظریہ کے تحت یہ ثابت کیا گیا کہ تہذیب وتمدن کی تمام ترقی جو آرٹ' سائنس اور سیاسی اداروں میں ہوئی۔ صرف یورپ ہی میں نہیں بلکہ کانسی کے زمانہ قدیم میں ہندوستان' چین اور شاید امریکہ میں بھی جو ترقی ہوئی۔ اس کی وجہ نوڈک' آ

رین اور جرمن نسلیں ہیں۔ جو کہ فطری طور پر حکمراں نسلیں ہیں۔ آثار قدیمہ اور علم لسانیات کی مدد سے فیرک نے ثابت کیا کہ پہلی متمدن ریاستیں جو مصر اور عراق میں قائم ہوئیں۔ انہیں نوڈرک فاتحین نے قائم کیا تھا' اور جب آریوں کا ریلا آیا تو انہوں نے ہٹی اور ان کی سلطنتیں قائم کیں اور یونان و روم کی تہذیبوں کو پیدا کیا۔ ایک اور مفکر فون ئے ڈن نے کہا کہ اگرچہ سمیریا والوں نے ریاضی کے بہت سے مسائل حل کئے مگر اس کے باوجود انہیں سائنس کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا بلکہ آرین برہمنوں کو جنہوں نے مذہبی موضوعات پر لکھا۔ انہیں صیح سائنسی علم قرار دیتا ہے۔

آریہ نسل برتری کے نظریہ کو انگریزی مورخوں کارلائل نے بڑی خوشی سے قبول کیا' کیونکہ اینگلو سیکسن آخر کار جرمن قبائل سے تھے جو کہ نوڈرک نسل کے سنہری بالوں و الے تھے۔ اس نظریہ نے برطانوی امپیریل ازم اور جرمنوں کے مشرک کی طرف دباؤ کی تحریک کو تقویت دی۔ موجودہ صدی میں یہ نظریہ امریکہ میں بھی بڑا مقبول ہے کیونکہ اس سے سیاہ فام باشندوں کو نسلی طور پر علیحدہ رکھ کر انہیں مراعات سے محر وم رکھا جاسکتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وقتی طور پر تھوڑے عرصہ کے لئے نسل پرستی کے جذبات میں کمی آئی مگر جنگ کے بعد پھر کسی شکل میں ان کا عروج ہو ا۔ سر آرتھر کیتھ نے اس نظریہ کو ''گول سر اور لمبوترے سر والے پیش کیا'' اس کے خیا ل میں 1915ء میں برطانیہ کے حکمران طبقے لمبوترے سر والے نورڈک نسل کے نہیں تھے بلکہ گول سر والے تھے جو' بیکر نسل'' کے تھے اور غالباً ان کی زبان آریاؤں کی ہوگی جب کہ انہوں نے 1800 صاق روم می برطانیہ پر حملہ کیا تھا۔

اس دوران میں گوبینو کے نظریہ کو ڈارون کے پیش کردہ خیال ''طاقت ور کی بقا'' سے مزید تقویت ملی۔ قومیں اور نسلیں بھی جانوروں کی طرح کئی قسموں میں تقسیم ہیں اور ان جنگ و جدل ''بقا کی جدوجہد ہوتی ہے فتح اور کامیابی کا مطلب ہوتا ہے'' بقا ''اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس قوم یا نسل میں بقا کے لئے توانائی اور قوت ہے ۔ اس تحت جنگ تاریخ کا ایک اہم موضوع قرار پاتا ہے جو کہ ایک فطری عمل ہے اور اس میں فتح برتری کی ایک سائنسی دلیل ہے۔ اس نقطہ نظر سے جنگ میں قتل عام ہوتا ہے' لوٹ مار ہوتی ہے اور خون ریزی کا سامنا ہوتا ہے وہ سب رخ انداز کر دیا جاتا ہے اور اسے فطرت کا ایک شاندار عمل کہا جاتا ہے جو کہ ایک تنظیم اور ترتیب پیدا کرتا ہے اس لئے کوئی حیرانگی کی بات نہیں کہ یہ نظریہ امپیریل طاقتوں اور قومو ں میں مقبول رہا مثلاً ''کیلٹوں نے ریچھوں اور بھیڑیوں کو بھگا دیا' اینگلو سکین نے کیلٹوں کو بھگا دیا'' موجودہ زمانہ ''جینیٹک'' کی سائنس نے نسل پرستی کے ان تمام مفروضوں کو رد کر دیا ہے اور تار سے ثابت ہو چکا ہے کہ کوئی نسل غالص اور اصلی نہیں رہی' لیکن اس کے باوجود نسل پرستی کے یہ خیالات اب بھی یورپ کی اقوام میں اس درجہ سے مقبول ہیں کہ یہ ان کے امپیریل ازم میں مددگار ہیں۔

کوریائی عوام کوریا ورکرز پارٹی کے گرد چٹان کی طرح متحد ہیں یہ امریکی سامراج جارحین کے خلاف لڑتے ہوئے موت کو خاطر میں نہیں لائیں گے اور اپنے ملک کی عزت اور آزادی کی حفاظت آخری دم کرتے رہیں گئے۔

☆ کامریڈ کم ال سنگ ☆

مینڈیلا کی زندگی کی کچھ ان کہی باتیں!

بشکریہ بی بی سی اردو

سنہ انیس سو باسٹھ میں کرنل فیکا دو واکنے نے جنوبی افریقہ کے سیاسی کارکن نیلسن منڈیلا کو گوریلا جنگ کی تربیت دی تھی جس میں دھماکہ خیز مواد نصب کر کے خاموشی سے فرار ہونے کے طریقے بھی شامل تھے۔ بعد میں امن کا نوبل انعام پانے والے نیلسن منڈیلا اپنی آزادی کی جدوجہد میں اس وقت ایتھوپیا میں تھے جہاں وہ افریقن نیشنل کانگریس کے مسلح بازو یومکنتو وی سوازی کو چلانے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ افریقن نیشنل کانگریس کی اس مسلح تنظیم نے سنہ انیس سو اکسٹھ میں جنوبی افریقہ میں متعدد مقامات پر بجلی کے کھمبوں کو تباہ کر کے اپنے وجود میں آنے کا اعلان کیا تھا۔ نیلسن منڈیلا گیارہ جنوری سنہ انیس سو باسٹھ کو غیر قانونی اور خفیہ طریقے سے جنوبی افریقہ سے چلے گئے تھے۔ وہ افریقن نیشنل کانگریس اور اس کی مسلح تنظیم کے لیے افریقی ملکوں سے سیاسی، مالی اور عملی حمایت حاصل کرنے کے لیے نکلے تھے۔ اس کے ساتھ ہی خود بھی گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کرنا تھا۔ نیلسن میڈیلا ایک سحر انگیز شخصیت کے مالک تھے اس دوران وہ دو مرتبہ ایتھوپیا کے دارالحکومت ادیس ابابا گئے جہاں وہ جن لوگوں سے ملے انھیں متاثر کیا۔ کرنل فیکا دو نے کہا کہ: 'نیلسن منڈیلا ایک صابر اور مضبوط طالب علم تھے۔ وہ بڑی توجہ سے احکامات سنتے تھے اور وہ دل پسند شخصیت تھے۔' کرنل فیکا دو اس وقت سپاہی تھے جب انھوں نے منڈیلا کو گوریلا جنگ کی تربیت دی تھی۔ اس وقت وہ خصوصی پولیس فورس کے ہنگاموں سے نمٹنے والے دستوں میں شامل تھے اور ادیس ابابا کے قریب تعینات تھے۔ وہ نیلسن میڈیلا کو ایک ایسے شاگرد کے طور پر یاد کرتے ہیں جو ہمیشہ خوش رہتے تھے اور ہمیشہ اپنے کام پر توجہ مرکوز رکھتے تھے۔ نیلسن منڈیلا نے انیس سو باسٹھ میں تنزانیہ کا بھی دورہ کیا اور انھوں نے آنجہانی وزیر سلوسوائی کے ساتھ قیام کیا۔ مینڈیلا کو تینتیس سال بعد یہ جوتے ملے ان کی بیوی وکی سلوسوائی نے بتایا کہ نیلسن منڈیلا جب جانے لگے تو ان کا سامان زیادہ ہو گیا تھا اور انھیں ایک سوٹ کیس چھوڑنا پڑا جس میں چمڑے کے براؤن رنگ کے جوتے تھے جو انھوں نے تینتیس برس تک سنبھال کر رکھے۔ انھوں نے کہا کہ اپنے شوہر کی ریٹائرمنٹ کے بعد وہ دارالسلام منتقل ہو گئے اور وہ یہ جوتے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد ان کے شوہر کو اقوام متحدہ میں نوکری مل گئی اور وہ نیویارک منتقل ہو گئے اور نیلسن منڈیلا کے جوتے بھی وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ پندرہ سال تک انھوں نے نیویارک میں بھی یہ جوتے سنبھال کر رکھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنی خواب گاہ کی ایک الماری میں یہ جوتے سنبھال کر رکھے۔ میں نے انھیں کبھی پالش اور صاف نہیں کیا لیکن میں نے ان کے اندر اخبار ٹھونس کر رکھے تاکہ یہ خراب نہ ہوں۔' انھوں نے کہا کہ یہ جوتے بڑے اعلیٰ چمڑے کے بنے ہوئے تھے اور بڑے مضبوط تھے۔ جب یہ جوتے انیس سو پچانوے میں منڈیلا کو واپس پہنچائے گئے تو وہ اس وقت بھی بالکل نئے لگ رہے تھے۔ اس وقت بھی منڈیلا کو یہ جوتے بالکل ٹھیک آئے اور انھوں نے مذاق کرتے ہوئے کہا کہ ان جوتوں نے اُن سے زیادہ سفر کر لیا ہے۔ مینڈیلا کا پستول جب مینڈیلا ایتھوپیہ چھوڑنے لگے تو جنرل ٹیڈیسی نے انھیں ایک پستول اور دو سو گولیاں پیش کیں۔ یہ پستول للّی لیوز فارم پر جہاں سے انیس سو تریسٹھ میں افریقن نیشنل کانگریس کے رہنما گرفتار کیے گئے تھے اور اسی فارم کی زمین میں کہیں یہ پستول دفن ہے۔ وکی نے مزید کہا کہ بہت سے لوگ اس بات پر حیران تھے

کہ یہ جوتے اتنے عرصے تک کیوں سنبھال کر رکھے۔انھوں نے کہا کہ:'میں چاہتی تھی کہ جو شخص اپنے ملک کے ساتھ اس قدر محبت کرتا ہے اس کو یہ جوتے مل جائیں۔'سنہ انیس سو باسٹھ میں کرنل فیکا دو کو یہ احساس نہیں تھا کہ جنوبی افریقہ کے جس شخص کو انھیں تربیت دینے کے لیے کہا گیا ہے اس کی جنوبی افریقہ میں کیا سیاسی اہمیت ہے۔'ہمیں صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ ایک مہمان ہے جو کچھ دن تک ہمارے ساتھ رہیں گے اور پھر واپس چلے جائیں گے۔'فیکا دو نے کہا کہ ہر چیز کو خفیہ رکھا گیا اور وہ بالکل اندھیرے میں تھے۔منڈیلا ایتھوپیا کے بادشاہ کی دعوت پر آئے تھے جو افریقہ سے نوآبادیات کے خاتمے اور آزادی کے سخت حمایتی تھے۔

اس وقت براعظم افریقہ میں ایتھوپیا کی فوج سب سے طاقت ور فوج تھی۔اس کے فوجی انیس سو ساٹھ میں کانگو میں اقوام متحدہ کے امن دستوں میں بھی شامل تھے اور اس سے ایک دہائی قبل ایتھوپیا کے دستوں نے کوریائی جنگ میں بھی حصہ لیا تھا۔مینڈیلا کی ایک ہر دل عزیز شخصیت تھے بادشاہ نے کئی افریقی ملک میں چلنے والے تحریکوں کے سرگرم کارکنوں کو فوجی تربیت کے لیے ایتھوپیا مدعو کیا تھا۔گوریلا جنگ کے علاوہ نیلسن منڈیلا کو فوج کی قیادت کرنے اور دفاعی سائنس کی تعلیم بھی دی گئی۔انھیں اس تربیت کے دوران پیدل سفر پر بھی لے جایا جاتا تھا جہاں انھیں اپنے سامان اور اپنی بندوق خود کمر پر اٹھا کر چلنا پڑتا تھا۔منڈیلا کو تربیت کا یہ حصہ بہت پسند تھا اور وہ اس بارے میں اپنی کتاب 'لانگ واک ٹو فریڈیم' میں بھی ذکر کرتے ہیں۔'منڈیلا کی ایتھوپیا میں تربیت چھ ماہ تک جاری رہنی تھی لیکن انھیں دو ہفتے بعد ہی جنوبی افریقہ جانا پڑا۔وہ سات ماہ ملک سے باہر گزار چکے تھے۔

جب منڈیلا ایتھوپیا چھوڑنے لگے تو جنرل ٹیڈیسی نے انھیں ایک پستول اور دوسو گولیاں پیش کیں۔یہ پستول للّی لیوز فارم پر جہاں سے انیس سو تریسٹھ میں افریقن نیشنل کانگریس کے رہنما گرفتار کیے گئے تھے اور اسی فارم کی زمین میں کہیں یہ پستول دفن ہے۔منڈیلا کو بھی پانچ اگست سنہ انیس سو باسٹھ میں گرفتار کیا گیا تھا جب وہ ملک واپس لوٹے ہیں تھے اور وہ اس وقت بھی فوجی وردی پہنے ہوئے تھے۔

کسی طبقہ کی بڑی اکثریت کو اپنے مفادات اور احساس دلانے کے لیے تاکہ وہ اپنی حکمت عملی تیار کر کے اس پر چل سکے اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس طبقہ کے ترقی یافتہ حصہ کو ہر قیمت پر اور فوراً منظّم کیا جائے۔چاہے ابتدا میں اس طبقہ کا بہت ہی معمولی حصہ ہی کیوں نہ اس تنظیم میں شامل ہو۔۔۔۔۔۔

لینن

نرگسیت کا مرض

مبارک حیدر

علم نفسیات کی اصطلاحات میں سے ایک نرگسیت بھی ہے۔ جس کا بنیادی مفہوم خود پسندی کا ہے، نفسیات کی یہ اصطلاح قدیم یونان ایک دیو مالائی کہانی سے اخذ کی گئی ہے۔ جس کا مرکزی کردار نارسس ایک خوبصورت ہیرو ہے جسے اپنے چاہنے والوں اور اردگرد کی دنیا سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اپنی تعریف سنتے سنتے وہ اتنا خود پسند ہو گیا تھا کہ ایک دن پانی میں اپنا عکس دیکھ کر وہ خود پر عاشق ہو گیا۔ رات دن اپنے عکس کو دیکھتا رہتا، بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو کر بھی پانی کو چھو نہیں سکتا تھا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ پانی کی سطح ملنے سے عکس ٹوٹ جائے گا اور اس کی شکل کا حسن ہزاروں ٹکڑوں میں بٹ جائے گا، چنانچہ پیاس سے نڈھال ہو کر مر گیا، دیو مالا کے ایک بیان میں ہے دیوتاؤں نے اسے نرگس کا پھول بنا دیا، اسی وجہ سے خود پسندی کو نرگسیت کا نام دیا گیا،

نفسیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ نرگسیت کی چند حالتیں ہم سب میں موجود ہوتی ہیں، یعنی خود اعتمادی اور عزت نفس اور مسابقت جو عمدہ انسانی صفات مانی جاتی ہیں، نرگسیت کی صحت مند شکل ہوتی ہیں، کیونکہ ان کا تعلق بھی ہماری انا سے ہوتا ہے۔ لیکن خود گری، یعنی اپنی شخصیت کی مثبت تعمیر کہ جس کی بنیاد دوسروں کی تباہی پر نہ رکھی گئی ہو، خود بینی یعنی اپنی کمزوریوں اور صلاحیتوں کا ادراک جسے خود شناسی بھی کہہ سکتے ہیں اور خود نگری یعنی اپنی نگرانی کرنا، یعنی زوال پر ور مریضانہ اور مہلک رویوں سے خود کو بچانا،،، یہ سب کسی بھی متحرک معاشرت کے بنیادی جوہر ہوتے ہیں، اگرچہ کردار کی ان کیفیتوں کا تعلق بھی فرد کی انا سے ہی ہے، تاہم ان کے لئے نرگسیت کی اصطلاح استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ نرگسیت سے مراد بالعموم ایسی نرگسیت ہوتی ہے جس کا علاج کیا جانا چاہیے، کیونکہ یہ شخصیت کا وہ مرض ہے جو تنظیمی اور سماجی معاملات میں سنگین مسائل کا سبب بنتا ہے۔ اس مرض کا شکار ہونے والے لوگ اردگرد کی دنیا میں اذیت اور تباہی کا باعث بنتے ہیں اور اس کا سب سے بڑھ کر خطرناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ مریض کبھی خود کو مریض نہیں مانتا۔ نہایت چابکدستی سے اپنا دفاع پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہیکہ جو اس کا علاج کرنا چاہتے ہیں، انہیں حاسد، گستاخ یا بدنیت ثابت کر دے۔ لہٰذا ایسے مریضوں کا علاج کرنے کے لیے عزیز و اقارب اور دوستوں کو بالآخر سکٹی یا جراحی کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

فرد کی مریضانہ نرگسیت جس طرح تنظیم یا خاندان کے لئے شدید مسائل کا باعث بنتے ہیں، اسی طرح اجتماعی یا تہذیبی نرگسیت اقوام عالم کی علاقائی اور عالمی تنظیموں میں کشیدگی، اضطراب اور بالآخر تصادم کو جنم دیتی ہے، اور انسانی برادری کی اجتماعی نشوونما کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

اس سرسری اور سطحی جائزہ سے پہلے انفرادی نرگسیت پر کی جانے والی تحقیق کا مختصر بیان ضروری ہے۔ یہ تحقیق ملٹی نیشنل کمپنیوں اور دوسری بڑی کاروباری یا انتظامی تنظیموں کے اندر پیدا ہونے والے ایسے مسائل کے حل کی خاطر کرائی جاتی ہے جو ان تنظیموں کے طاقتور یا اہم افراد کی نرگسیت سے پیدا ہوتے ہیں، مثلاً کسی تنظیم کی اجتماعی کارکردگی میں کسی ایک شخص کی حد درجہ بڑھی ہوئی خود پسندی اور جارحانہ انا پرستی ایسی رکاوٹیں اور ایسی الجھنیں پیدا کر دیتی ہے جس سے تنظیم کو نقصان پہنچتا ہے، جبکہ متعلقہ شخص کو نہ تو اس کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی وہ احساس دلائے جانے پر اپنی اذیت ناک کوتاہی کو قبول کرتا ہے، ایسے افراد کے لئے ماہرین کی تقریباً متفقہ رائے یہ ہیکہ ان کا علاج صرف یہ ہیکہ ان کے خلاف اجتماعی اور کرخت تنقید کا نشتر استعمال کیا جائے، ان کے وہ ہاتھ باندھ دیئے جائیں جن سے وہ تنظیم کو توڑتے ہیں، ڈاکٹر ڈیوڈ تھامس کا کہنا ہے کہ نرگسیت کے مریض کو پہچاننا اس لئے مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ ہر لمحہ اداکاری کے ذریعے اپنی انا کی حفاظت کرتا ہے اور دنیا کے سامنے ایک جعلی تشخص بنائے رکھتا ہے، چنانچہ نرگسیت کے مریض دھوکہ دہی کے استاد بن جاتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو پہچاننا اس لئے از حد ضروری ہے کہ یہ اپنے منفی رویوں سے تنظیم کی کارکردگی خراب کرتے ہیں،

نرگسیت کے مرض کی مندجہ ذیل علامات قابل غور ہیں

1۔ نرگسی شخص کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اجتماعی ضرورتوں کو اپنی ضرورتوں پر اولیت دے سکے۔ وہ دوسروں کے لئے ہمدردی سے خالی ہوتا ہے، مثلاً وہ جب آپ کی خیریت پوچھتا ہے تو یہ ایک عادت اور حسن اخلاق مظاہرہ ہوتا ہے، اسے حقیقت میں آپ کی خیریت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

2۔ جب نرگسی شخص کی انا کو خطرہ پیدا ہو جائے تو وہ صحت مند آدمی سے کہیں زیادہ

ردعمل کا اظہار کرتا ہے حتیٰ کہ نرگسی طیش کا مظاہرہ کرتا ہے، جب کسی تقابلی جائزہ نتیجے میں وہ دوسروں سے کم تر نظر آئے تو وہ عام آدمی سے کہی زیادہ غم وغصہ اور جارحیت دکھاتا ہے۔ دراصل اس کے مزاج کے اتار چڑھاؤ کا تعلق عام طور پر اسی بات سے ہوتا ہے کہ سماجی تقابل میں اسے اپنے بارے میں کیا خبر آئی ہے۔ یعنی تعریف ہوئی تو اتراتا ہے اور اگر کم تر قرار دیا گیا ہے تو آپے سے باہر ہوتا یا پھر احساس مظلومیت کا شکار ہو جاتا ہے۔

3۔ عام آدمی ناکامی کی صورت میں خود کو قصور وار سمجھتا ہے لیکن نرگسی شخص اپنی ناکامی کو اپنی ذات سے باہر نکال دیتا ہے، یعنی الزام دوسروں پر ڈال دیتا ہے، کیونکہ ایسے شخص میں اپنی ناکامی کو شرم ناک بنا کر اپنی نفسیات میں مستقل گوندھ لینا کارِ جان ہوتا ہے۔ لہٰذا اس شرم ناک بات کو یعنی اپنی ناکامی کو ہر صورت میں اپنے اوپر سے ہٹا کر کسی اور پر ڈالنا ضروری سمجھتا ہے، البتہ کبھی کبھی جب نرگسی شخصیت کی نظر میں اپنا مقام بہت ہی بلند ہو اور اسے اپنا مقام پست ہونے کا خطرہ نہ ہو تو ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ناکامی کی ذمہ داری قبول کر لے، تاہم اس میں بھی اپنی عالی ظرفی کی دھاک بٹھانے کا جذبہ موجود ہوتا ہے، اور وہ اپنی کوتاہی کی ذمہ داری قبول کرنے سے پہلے اس بات کی تسلی کر لیتا ہے کہ اس کا ثمر اسے تعریف وتوصیف کی صورت میں ملے گا۔

4۔ تکبر، خودنمائی، فخر اور فنکارانہ مطلب براری نرگسی شخص کی صفات ہیں جن کا مظاہرہ وہ کبھی کھلے بندوں اور کبھی نفاست سے کرتا ہے۔ وہ تعریف وتحسین کا بھوکا ہوتا ہے، نرگسی طیش، دوسروں کی کردار کشی اور اپنی نمائش، نرگسی شخصیت کے طرز عمل کے ظاہری حصے ہیں۔ مثلاً اپنے ہم پلہ یا فائق لوگوں کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ مجھ سے جلتے ہیں، یا یہ کہ میرے خلاف سازش کرتے ہیں ایسے الزامات وہ کبھی کھلے بندوں اور کبھی اشارتاً کرتا ہے۔

5۔ ندامت اور تشکر دونوں سے انکار نرگسی شخصیت کا وہ نفیس ہتھکنڈہ ہے جس سے وہ اپنی فضیلت وعظمت کا تحفظ کرتا ہے، یعنی اگر اپنے کوتاہی پر نادم ہو یا دوسروں کی نوازشات کا شکر گزار ہو تو اسے اپنے عظمت جاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر میٹنگ میں دیر سے آئے تو کہتا ہے فلاں شخص نے مجھے باتوں میں الجھائے رکھا اور دیر کرادی، یا اگر کاروبار میں نقصان ہو جائے تو عالمی سرمایہ دار کی چکر بازی کو ذمہ دار ٹھہرائے گا یا اپنے شراکت دار کی نالائقی وغیرہ وغیرہ۔۔۔

6۔ چاہے اس کی گفتگو میں نمائش کا عنصر صاف نظر آ رہا ہو پھر بھی نرگسی مریض کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی اہمیت کا تاثر اس انداز سے چھوڑے کہ جیسے اس کا مقصد نمائش یا بڑ مارنا نہیں تھا، مثلاً کسی بڑی شخصیت سے ملاقات کا خصوصی ذکر کرنیکی بجائے اس طرح خبر پھیلائے گا جیسے اس شخصیت سے ملاپ ایک معمول کی بات تھی۔ مثلاً مسٹر فلاں میرے ہاں کھانے پر آئے تو کہنے لگے یار تمھاری وہ بات اور وہ بات وغیرہ وغیرہ،،،، مقصد دو ہوتے ہیں، سننے والے سے ایک حد ادب قائم کرنا اور اپنے اعلیٰ مقام کی خبر پھیلانا،

سائیکالاجسٹ ڈاکٹر ڈیوڈ تھامس کے پی ایچ ڈی پروفائل سائٹ پر نرگسی شخصیت والوں کی خواص مختصراً یوں ہیں

1۔ ان کے ہر کام میں دوسروں کے جذبات سے لاتعلقی ہوتی ہے، مثلاً رسمی اخلاقیات اور اپنی نیکوکاری کے اظہار کے لئے مزاج پرسی وغیرہ۔ جس میں حقیقی دلچسپی موجود نہیں ہوتی۔

2۔ ان کے تقریباً تمام خیالات اور طرز عمل دوسروں سے مستعار ہوتے ہیں، یعنی یہ لوگ ایسے لوگوں کی خیالات واطوار کی نقالی کرتے ہیں، جنہیں یہ سند مانتے ہیں اسے عکس کی پیروی (Mirroring) کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ ان بڑے لوگوں کی پیروی کے ذریعے دراصل خود کو عظیم محسوس کرتے ہیں۔

3۔ دوسرے کے مسائل وجذبات سے لاتعلقی کے نتیجہ میں انہیں دوسروں کی بات کاٹنے اور اپنے سنانے کی جلدی ہوتی ہے، یہ کبھی دوسروں کی بات سمجھنے کے لئے نہیں سنتے بلکہ اس لئے سنتے ہیں کہ اس کے جواب میں انہیں کیا کہنا ہے۔ لہٰذا ان کے سیکھنے کے عمل محدود اور ان کا علم انا سے رنگا ہوا ہوتا ہے۔

4۔ یہ چھوٹے کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے، بلکہ دوسروں پر ڈالتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نظر میں چھوٹے چھوٹے کاموں میں وقت ضائع کرنا ان کی اہم شخصیت کے شایان شان نہیں ہوتا۔

5۔ ان کے خیال میں کام کے قوائد کی پابندی کرنا ان پر لازم نہیں ہوتا،

6۔ اگر انہیں یقین ہو کہ پکڑے نہیں جائیں گے تو دھوکہ دہی سے نہیں چوکتے۔

7۔ جب آپ کام میں ان سے شراکت کریں تو آپ یقین رکھیں کہ کام کا بڑا حصہ آپ ہی کو کرنا ہوگا۔

8۔ یہ جب کوئی کام دوسروں کے سپرد کرتے ہیں تو پھر اس کی چھوٹی چھوٹی تفصیل میں دخل اندازی بھی جاری رکھتے ہیں، پھر اگر کام بخوبی مکمل ہو جائے تو اس کا سہرا اپنے سر باندھ لیتے ہیں لیکن اگر بگڑ جائے تو الزام اس پر ڈالتے ہیں، جسے کام سپرد کیا گیا تھا۔

9۔ جب موضوعِ گفتگو یہ خود ہوں تو یہ دیر تک سنتے ہیں اور کبھی روکتے نہیں، تھکتے نہیں، لیکن اگر گفتگو کا موضوع کوئی دوسرا ہو یا ایسا مسئلہ زیر بحث ہو جس میں ان کی ذات کا ذکر نہیں آتا تو یہ دوران گفتگو بے قرار یا لاتعلق ہو جاتے ہیں۔

10۔ نرگسی شخص کے ساتھ کام کرنے والوں پر ذہنی اور نفسیاتی دباؤ بڑھ جاتا ہے، لہٰذا جن تنظیموں میں یہ لوگ بالادست حیثیت میں ہوں، وہاں ملازموں اور اہلکاروں میں غیر حاضری کا رجحان بڑھ جاتا ہے جہاں یہ ماتحت اہلکار کی حیثیت میں ہوں وہاں ساتھیوں سے ٹکراؤ کی حالت میں رہتے ہیں یا احساس مظلومیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ڈیرہ غازیخاں میں سرکار کے تماشے

دادشاہ بلوچ

پاکستان نے جدامجد برطانوی سرکار کی بالادستی اور مظلوم اقوام پر قبضہ گیریت کے نشے نے بلوچ ریاست کا کئی حصوں میں بٹوارا کیا تھا۔ کیونکہ بلوچ قوم وہ واحد قوم ہے جس نے ہر سامراجی قوت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اپنی آزادی اور بلوچیت کو ترجیح دی۔ اس سخت گیر موقف اور کھٹن تاریخ دیکھنے والی قوم پر اپنا تسلط جمانا ماسوائے Devide and rule کی پالیسی کے اور کچھ نہیں تھا۔ بالاآخر انگریز اپنی اس سامراجی پالیسی میں کامیاب ہوگئے۔ اس بٹوارے میں بلوچستان کا بہت اہم اور تاریخی علاقہ ڈیرہ غازیخاں اور راجن پور کو سب سے پہلے کاٹ کر پنجابی پالتوؤں کے سامنے رکھ دیا۔

اس طرح نوری نصیر خان کے عظیم بلوچستان جو کراچی سے ہلمند اور چھابہار سے دریائے سندھ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کو تقسیم در تقسیم کیا گیا۔ انگریز سرکار کے جانے کے بعد بھی ڈیرہ غازیخاں کا علاقہ آج بھی بدستور پنجاب میں شامل ہے ڈیرہ اور راجن پور کے وسیع علاقے میں تمام بلوچ قبائل کچھ نہ کچھ حد تک ضرور آباد ہیں ۔لیکن زیادہ تر آبادی، بزدار لغاری، لنڈ، کھوسہ، احمدانی، ٹالپور، لاشار، دریشک ،مزاری، گورشانی، گوپانگ اور سید قبائل کی ہے۔ جہاں انگریز سرکار کی کٹھ پتلی ریاست پاکستان نے سندھ اور بلوچستان کے دیگر علاقوں میں اپنی نوآبادتی حال بچھانا شروع کیا۔ وہیں ڈیرہ غایخان بھی نوآباد کار مہاجرین سے بچ نہ پایا ۔ ہندوستانی مہاجرین کے علاوہ اپر پنجاب کے پنجابی اور ملتان اور بہار پور کے جھانوں کو بھی یہاں بسایا گیا۔ بلوچ کلچر اور زبان پر حملے کے ساتھ ساتھ یہاں کے بلوچوں کو ایک بہت ہی اندھے نوآبادیاتی نفسیات میں مبتلا کیا گیا۔ لیکن یہاں کے بلوچ آبادی آبادی 90% سے زیادہ ہے۔ یہاں کے 70% بلوچ بلوچی اور باقی جانکی یعنی (اسرائیکی) بولتے ہیں ۔قدرتی وسائل اور زراعت سے مالا مال یہ خطہ آج بھی ماضی کو یاد کر کے سرمچاروں کو آواز دے رہا ہے۔

جہاں بلوچستان کے دوسرے علاقوں میں پاکستان ریاست کا لوٹ کھسوٹ جاری ہے، وہاں ڈیرہ غازیخان اور راجن پور سے پچھلے کئی دہائیوں سے بلوچ مال، مڈی و وسائل کو بے دردی سے لوٹ مار رہا ہے۔ ڈیرہ غازیخاں کے قبائلی علاقہ جات معدنی وساحل سے بھرے پڑے ہیں ۔ جہاں یورینیم ، گیس ،تیل، جپسم اور دوسرے کئی معدنی وسائل سے واضح مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ پچھلے چار دہائیوں میں PACE نے بلوچ مادرِ وطن کا سینہ چاک کر کے یورینیم نکالنے کا کام شروع کیا ہے اور سامراجی ریاست پاکستان نے انہی سے ایٹم بمب بنا کر انسانی نسل کشی میں دوسرے سامراجی ریاستوں کے ساتھ اپنا نام ایک بدمعاش اور دہشت گرد کے طور پر روشن کیا ہے۔ لیکن اس خطے کے فرزند آج بھی اندھیروں میں پڑے ہوئے ہیں ۔ آج بھی اکیسوی صدی میں یہاں کی مائیں زچگی کے دوران شہروں کی طرف آتے ہوئے مرجاتی ہیں۔

اور اٹامک کے فاضل مادوں کی وجہ سے کینسر، یرقان اور دوسری مہلک بیماریاں یہاں کے باسیوں کا مقدر بن چکی ہیں۔ بغل چُر، ریخو، بھارتی، ڈموڈک، راکھی گاج، زندہ پیر اور ماڈی میں PACE، OGDCC اور سیمنٹ فکٹری کے آس پاس رہنے والے بلوچ قبائل سکول جانے کے بجائے اپنا نفر کندھے پر لٹکا کر اپنے ریوڈ کو ہانکتے ہوئے پہاڑوں کا رخ کرتے ہیں۔ اتنی بڑی کمپنیاں جو اس علاقے میں لوٹ کھسوٹ اور استحصال کا عمل جاری رکھی ہوئی ہیں ۔ مقامی آبادی کو مزدور رکھنے سے بھی گھبراتے ہیں۔ ان کمپنیوں میں کام کرنے والا عام سر بھی پنجاب اور KPK سے آتا ہے۔ اتنا کچھ گزرنے کے باوجود بھی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پھر بھی یہاں کے بلوچ خاموش ہیں تماشائی ہیں ۔ یہان کے زانتکار طبقہ میں شاعر حضرات تو لگ شیشغ اور لیل کی تعریفوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اساتذہ کرام نے چوری اور حرام خوری کا کام سنبھالا ہوا ہے، صحافی حضرات لاہور، اسلام آباد اور فیصل آباد کی خبروں پر وقت گزار رہے ہیں۔

سرداروں اور وڈیروں کو سرکار کی طرف سے بھتہ ملتا ہے اور عوام سورج طلوع ہونے کے بعد غروب کا انتظار کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے قبائلی جھگڑوں میں الجھادیئے گئے ہیں۔ صاف ظاہر ہے جب عوام کے پاس کچھ کرنے کو نہیں ہے تو آپس میں لڑنے پر وقت گزاری کرتے ہیں۔

ملکیت کا ایک ایسا تصویر ہے جب ایک آدمی دوسرے کے زمین پر غلطی سے بھی اپنی مال مویشیوں کے لیئے چارہ اور ٹال لینے جاتا ہے تو ایک دوسرے کے گلے گھونٹے جاتے ہیں اور لاپروہ اتنا کہ اسی زمین پر جب قابض غیر

فطری ملک پاکستان بزور اپنے قبضہ گیریت کو دوام بخش رہا ہے، بلوچ مال مڈی کو لوٹنے میں مصروف ہے تو اس وقت اس دھرتی کا کوئی وارث نہیں بنتا۔

ملا اور نام نہاد جہادی اس دھرتی کو لاوارث سمجھ کر آہستہ آہستہ اس علاقے کا رخ کر رہے ہیں تا کہ لوگوں کو مذہبی جنونیت کی طرف راغب کر کے ان کی ذہن تاریخ، اصل مسلمانیت اور سکولرز خیالات سے ہٹایا جائے کیونکہ ریاست بخوبی واقف ہے جب یہاں کے بلوچ نوجوان اپنی قوم کے وارث سرمچاروں، شہدا اور کامریڈ بالاچ مری کے راستے پر قدم رکھ کر اپنی ذاتی خواہشات کو کچل کر قومی مفاد کی راہ پر گامزن ہو کر بندوق اٹھا کر پہاڑوں کا رخ کیا تو یہ ایک بڑے مزاحمت کی طرح ان کے سامراجی خواہشوں کے آگے دیوار بنے گا۔ کیونکہ یہاں کے ملک بوس چٹانیں دشمن کے لیئے مصیبت بن کر ٹوٹ پڑیں گے۔ حالیہ دنوں میں باقی بلوچستان میں اپنی لپانی اور سرمچاروں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور ان کی کامیاب کاروائیوں کو دیکھ کر ریاست کو یہ خطرہ درپیش ہوا کہ کہیں ڈیرہ غازی خان بھی ان کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ تو اس خطرے کو دیکھتے ہوئے سرکار نے یہی پہاڑی علاقوں رونکیں، طنوخ، تجارتی سرطنوخ فورٹ صزو اور ماڑی میں اپنا اسر رسوخ قائم کرنے کے لیئے سڑکوں کا ایک جال بچھانے کا نیا شیطانی منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس منصوبے میں آقا کے ساتھ وفاداری کے ثبوت کے طور پر بلوچستان میں تعینات پنجاب کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر مالک نے کھچی موسیٰ خیل سے تونسہ شریف تک ایک سڑک بنانے کا کام اپنے ذمے لیا ہے۔ فورٹ منرو سے کمڈی لنگ اور سخی سرور سے بمقام رونگن سے ہوتے ہوئے کمڈی لنک تک سڑک کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ فاضل پور سے ماڑی کے راستے میں ہوتے ہوئے فرٹ منرو اور کلوغ تک سڑک بنانے کا منصوبہ مکمل ہو چکا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کا مقصد ماڑی سے لے کر یک ہی اور بینہو تک کے پہاڑوں کو فوج اپنا بارڈر بنانا چاہتی ہے۔ اپنے حوس اور بھوک کے پیٹ کو بھرنے کیلئے اس شیطانی منصوبے کو پایا تکمیل تک پہنچانے کیلئے ریاست نے چینی کمپنیوں کو علاقے میں چھوڑ دیا ہے۔ اور بلوچ کو نام نہاد ترقی کا لالچ دے کر بیوقوف بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

لیکن یہاں کے بلوچ عوام سے کوئی پوچھے کہ کیا پچھلے کمپنیوں ,PAEC , OGDCL نے کتنے لوگوں کو مزدوری دی کتنے سکول نبوائے کتنے ہسپتال دیئے جہاں بلوچ عوام کا علاج ہوتا ہے۔

یقیناً اس بار ریاست بلوچ وسائل کو لوٹ کھسوٹ کر بلوچ عوام کو اور پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرے گا ہوسکتا ہے، کچھ وڈیروں کی خاطر رکھنے کیلئے چند ایک لوگوں کو مزدوری بھی دی جائے لیکن اس مزدور کو وسائل لوٹنے کے بعد دھتکار دیا جائے گا۔ اس چال سے بچنے کیلئے بلوچوں سے دست بندی کرتا ہوں کہ دشمن کی چال سے واقف ہونے کیلئے تھوڑا سا سوچیں۔ مجھے یقین ہے، دشمن کی چالیں اب نہیں چل سکتیں۔ قبائلی سوچ سے نکل کر قومی سوچ پر اکھٹا ہونا ہوگا۔ ریاست اپنی ہی سرزمین پر بلوچ قوم کو نشانہ بنانے کا منصوبہ بنا رہی ہے، یہ ہمارا فرض ہے کہ موجودہ بلوچستان کے وسیع بلند و بالا پہاڑوں اور چشم دید صحراوں میں سرفروش سرمچاروں جنہوں نے بلوچ راج اور گلزمین کی خاطر انقلاب اور مکمل آزادی کا جونعرہ بلند کیا ہے، ان کے ہمگام اور ہم کو پگ ہو کر ان کی طرح قومی آزادی کے لیئے جدوجہد کریں اور بلوچ سرزمین یعنی تاریخی بلوچستان کے سرحدوں کی مکمل طور پر پاسبانی کریں۔

''بقول شہید واجہ سنگت ثناء بلوچ" مجھے یقین ہے کہ دوسرے بلوچستان کی طرح ڈیرہ غازی خان سے بھی سرمچار نکلیں گے اور آزادی کے راہ میں دوسرے بلوچوں کے ساتھ ہونگے۔''

''اگر میں جان بچا کر بھاگ گیا تو مرجاوں گا۔ اگر زہر پی کر مر گیا تو قیامت تک زندہ رہوں گا۔''

(سقراط کا اپنے دوستوں کو جیل سے بھاگ جانے کے تجویز پر جواب)

”ماما کا سفر جاری ھے“ انسانیت کیلئے دیکھتے ہیں 10 دسمبر کو انسانی حقوق کی تنظیمیں اور عالم اقوام کیا کرتے ہیں

جوہر بلوچ

بلوچ قوم بھی دنیا کے دوسرے اقوام کی طرح انسانی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور وہ نظام جو دنیا کی تمام قائم کردہ نظام سے اعلیٰ و برتر قرار پاچکا ہے جسے انسانیت کہتے ہیں ۔ بلوچ قوم نے ہر وقت انسانیت کی پاسداری کی ہے اور کررہا ہے۔لیکن دنیا کے چند سامراج ذہنیت کے مفاداتی لوگوں نے ہر وقت بلوچ قوم کی انسانیت اور انہی کی حقوق کو چھینے کی کوششیں کرتے آرہے ہیں۔حتیٰ کہ سامراجوں نے اپنی مقاصد کی تکمیل کیلئے انسانیت کے تمام اصولوں کو یہاں پامال کودیا ہے اور کررہے ہیں۔جس میں بلوچ قوم کے انسانیت کے درجہ کے رسم و رواج کی پامالی، دین و مذہب کی پامالی، مال و دولت کی لوٹ ماری، ننگ و ناموس کی پامالی اور وہ تمام حقوق جو ہر انسان کو چاہیے وہ سب کے سب کی پامالی شامل ہیں ۔سب سے بڑھ کر ہماری تمام حقوق کی پامالی کی وجہ وہ حق ہے دنیا میں کوئی بھی ان سے انکاری نہیں ۔ وہ ہے آزادی جو کہ بلوچ قوم سے ہر وقت سامراج چھینتے آرہے ہیں۔باقی اگر بلوچستان میں کوئی ننگا پیر گھومتا ہے، کسی کو دو پٹہ نہیں، کسی کو دو وقت کی روٹی میّسر نہیں، کوئی بے گھر ہے، کوئی بھوکا، کوئی دن رات جسمانی مشقتیں کاٹ کر مزدوری کرتا رہتا ہے اس کے باوجود ذہنی بے چینی میں مبتلا ہے، کسی کی عزت پامال ہوتی ہے یا کہ کوئی منشیات کا شکار ہوکر اپنی تمام انسانی صلاحیتیں کھوکر آج پاگل بن کے گھومتا ہے اور مختلف برائیوں کا شکار بنادیا گیا ہے، پوری بلوچ قوم وہ دولت جسے علم کہتے ہیں انسان کو انسانیت کے اعلیٰ مقام تک پہنچاتا ہے اس سے محرومی، اور بلوچ قومی پسماندگی سب کا سبب قومی غلامی ہے ۔ ہماری وہ حق جسے آزادی کہتے ہیں ۔ہم سے مختلف ادوار میں سامراج چھینتے آرہے ہیں ۔آج کل پاکستان کے قبضے میں ہے ہماری آزادی۔ایک بات دنیا بھر میں مشہور ہے اور حقیقت بھی کہ سامراج کا نہ باپ ہوتا ہے، نہ ماں، نہ بھائی، نہ قوم، نہ دوست، نہ کوئی حقیقی رشتہ دار۔ان میں انسانیت ہونا بہت دور کی بات ہے بلکہ ہوتا ہی نہیں ہے۔انکو اپنے مفادات سب سے عزیز ہوتے ہیں، اور وہ اپنی مفادات کی تکمیل کیلئے ہر وہ کام کرتے ہیں جس سے انکی مقاصد تکمیل تک پہنچ جائیں۔چاہے دوسری طرف وہ اعلیٰ اور خوبصورت اور پوری دنیا میں مانے جانی والی نظام انسانیت کا آخری حد تک رسوائی ہو۔اور ہم نے پڑھا، سنا اور دیکھا بھی ہے سامراجوں کو۔ سامراج کی اصلیت کو جاننے کے بعد ہم اچھی طرح جانتے ہیں وہ اپنا کام کرتے جاتے ہیں ۔اپنے مقاصد حاصل کرنے کے راستوں میں کوئی بھی آجائے وہ کاٹتے رہیں گے۔چاہے راستے پر انسانیت اور انسانی سریں ہوں وہ کاٹتے رہتے ہیں سامراج کو دنیا کی کسی اصول کا پرواہ نہیں ہوتا وہ اصولوں کو خریدنے کی نشے میں نیچے نہیں دیکھتا انکی آنکھیں اپنی مفاداتی مقاصد کی طرف ہوتے ہیں سامراج لوہے کی ٹائر والی ٹینکوں پر سوار ہوتے ہیں، وہ انسانوں کو کچلتے رہتے ہیں۔وہ لوگ صرف ٹینکوں کی ٹکر سے بچتے ہیں جو بھاگ کر انسانیت کو رسوا ہوتے دیکھ دیکھ کر دوسرے مختلف سامراج کے درد اور عذابوں سے روز روز مرکر ایک دن ابدی نیند سوکر صرف آنے والے انسانی نسل کیلئے عذاب چھوڑ جاتے ہیں۔آج کل بلوچستان میں یہی صورتحال ہے انسانوں کی جسم کو نوچ کر سر کاٹنے کے بعد مسخ کیئے جاتے ہیں، سامراج کی لوہے، زہریلے، آگ برسانے والی آلات سے۔سامراج کی تاریخ پڑھ سن اور دیکھ کر سمجھ چکے ہیں کہ وہ اپنی مفاداتی مقاصد کی تکمیل کے سفر میں سب کچھ کر جاتا ہے۔وہ نیچے نہیں دیکھتا کہ انسان کچلے جارہے ہیں۔ہاں وہ ایک الگ بات ہے کہ بلوچ بذات خود لوہے کے ٹرکوں، ٹینکوں کے نیچے سوکر، تیز رفتار سرخ گولیوں کے ٹارگٹ پر سینہ تان کر یا آسمان سے آتشی بادلوں کے زہریلی اور جلا کر راکھ کردینے والی ژالہ باری سے انسانیت اور اپنی انسانی اولین اور ضروری حق آزادی کو رسوا ہوتے دیکھ کر دردناک اور اذیتیں دینے والی ہر تکلیف برداشت کررہا ہے لیکن رسوائی نہیں۔اب ہم نے باقی حقوق کا فکر چھوڑ دیا ہے اور ہم نے سبق بھی لیا ہے مستقبل سے کہ آزادی کے سوا باقی حقوق کیلئے وقت و جان قربان کرنا بے وقوفی اور بربادی ہے۔آج ہمارے پاس صرف ایک حق بچا ہے جو دنیا کی کوئی بھی طاقت کسی سے چھین نہیں سکتا ہے ہاں اگر کوشش کرے تو خود وہ حق دلاتا ہے وہ ہے مرنے کا حق ۔صرف اور صرف مرنے کا حق ۔اب ہم نے بستر پر مرنا چھوڑ دیا ہے اور مرنے کے حق کو اب ہم بھوک، پیاس، دولت، سمیت دوسرے عام چیزوں کے حصول کیلئے استعمال کرکے رسوائی سے بچا کر اُس حق کیلئے استعمال کررہے ہیں جن کے حاصل ہونے سے باقی سب کے سب حقوق خود بخود حاصل ہوجاتے ہیں۔دنیا کو ہم بتا چکے ہیں کہ

ہمارے پاس مرنے کا حق ہے اور ہم نے مر کر بھی دکھایا ہے۔ ہاں ایک بات یہاں واضح کرتا چلوں کہ ہم مر کر بھی صرف اپنی زندہ رہنے کیلئے۔ نہ کہ دوسری قوموں کو غلام بنانے کیلئے، نہ لوٹ مار کی جنگ میں، نہ کسی کی عزت کی پامالی کی سزا میں، نہ کسی کی رسوائی کیلئے۔ یہ جنگ ہماری آزادی کی جنگ ہے ہم آزادی کیلئے مر رہے ہیں ہم نے صرف روز روز کا فضول مرنا چھوڑ دیا ہے اور ایک مرتبہ مرنے کا فیصلہ کی ہے وہ بھی اپنی قومی پہچان کو زندہ رہنے کیلئے۔ ہمارے پاس بندوقیں ہماری دشمن کے وجود سے پہلے ہی بہت تھیں مگر کبھی بھی انسانیت کی رسوائی کیلئے استعمال نہیں ہوتے تھے ہاں اگر کبھی کبھی گولی چلتی تھی وہ بھی خوشیوں کے موقعوں پر ہوا میں۔ اس وقت کے گولیوں کی توار سے لوگ نہیں بھاگتے بلکہ جہاں بھی ہوتے سن کر وہاں گولی چلنے کی جگہ آتے وہ جانتے تھے کہ ضرور کسی نہ کسی طرح کا خوشی ہوا ہے۔ لیکن آج انسانیت سے عاری ہمارے دشمن کو کسی سامراج نے اپنی مقاصد کو پانے کیلئے بندوق ہاتھ میں دیکر ہماری سرزمین کو انسانی خون سے رنگ رہا ہے اور ہمیں بدنام کر رہا ہے۔ ہمارے وطن پر جنگل کا قانون قائم کر دیا ہے اور جنگل کا قانون ہے کہ مرو یا مارو۔ آج ہماری کہانی بھی ایسا ہی ہے، ہم پر جنگ مسلط کر دیا گیا ہے۔ وگرنہ دنیا کو بھی اچھی طرح ہماری (بلوچ) متعلق معلوم ہے کہ ہم میں دنیا کیلئے کتنی بھائی چارگی اور ہم آہنگی ہے۔ ہاں ہم صرف غلامی سے انکاری رہے ہیں ہر وقت کیونکہ غلامی ہے کہ باقی سب حقوق ہمارے تو صحیح مگر انسانیت جس نے دنیا کو سہارا دے رکھا ہے اور نام دی ہے اسی کی پامالی ہوتی ہے اور رہا بھی ہے۔ آج اگر ہم (بلوچ) مر رہے ہیں مسخ ہو رہے ہیں، سڑ رہے ہیں، ہماری والدین بھی کبھی کبھی ہماری مردہ جسم کو پہچانتے نہیں ہیں۔ یہ سب آزادی کیلئے برداشت کر رہے ہیں۔ بقول میرے بہن بی ایچ آر او کے چیئرپرسن بی بی گل کے کسی کا اگر کوئی عام شے غائب ہو جائے وہ کتنا بے چین ہو جاتا ہے، آج ہمارے (بلوچ کے) بھائی، باپ، بیٹا، ماں، بہن کئی سالوں سے لاپتہ ہیں پتہ نہیں چلتا کہ کہاں اور کس حالت میں ہیں۔ جب ان میں سے کسی کو اچانک کوئی چرواہا جنگل میں یا راہگیر سڑک کنارے دیکھتا ہے تو وہ بھی مسخ شدہ ڈھانچے کی شکل میں۔ وہ خود بات نہیں کرتے ہمیں اپنی زبان سے دوسرے لاپتہ بلوچوں کے کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا البتہ انکی شریر کے زخم ہمیں خود بتا دیتے ہیں کہ وہ وہاں کیسی زندگی گزار رہے ہیں انہی کے جلے ہوئے جسموں کے ٹکڑوں اور گہری چوٹوں کو ہم نے فوٹوز اور ویڈیوز کے ذریعے ترقی یافتہ اور انسانیت کے دوست سمجھے جانے والے ممالک میں بھیج دیئے ہیں بلکہ وہاں تو انسانیت نے زیادہ ترقی کی ہے ٹیکنالوجی کے میدان میں بلکہ وہ ان جلے ہوئے مسخ شدہ جسموں کی زبان کو اچھی طرح سمجھ سکیں کہ کیا بول رہے ہیں اور کہنا کیا چاہتے ہیں، مسخ کیوں ہوئے ہیں۔ انکے مقاصد کیا ہیں۔ ہم نے اپنی مدد آپ کم ہی سہی مگر گنجائش کے مطابق مسخ شدہ جسموں کی زبان اور گرنے کے مقاصد سے اپنی قلم اور توار سے تشریح کرنے کی ہر ممکن کوششیں کی اور کر رہے ہیں، لیکن کیا کریں کہ دنیا کی سرحدیں بہت دور ہیں ہماری قلم دور تک گھوم نہیں سکتا اور توار جا نہیں سکتا۔ قلم کی پرواز اور توار کو تیز کر دینے والی سائنسی آلات ہمارے پاس نہیں۔ اور ہمارے دشمن کے ہاں ہے وہ سائنسی آلات کو ہماری دبی ہوئی آواز اور بے بانزل والی قلم کو مزید دبانے کیلئے اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے استعمال کر رہا ہے ہمارے خلاف۔ اور دنیا کے سائنسی آلات ہماری کام ابھی تک نہیں آ رہے ہیں کہ وہ ہماری قلم اور توار کو دنیا کے انسانوں تک پہنچائیں۔ تاکہ دنیا والے خون سے لکھی ہماری قلم کے الفاظ اور دردناک چیخوں جیسی توار کو سمجھ سکیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ کبھی کبھی مسخ شدہ لاش پر، مسخ شدہ کے جنازے یا کہ کسی جگہ کھڑے ہو کر اپنے بلوچ عوام کو اکھٹا کر کے اپنے زندہ رہنے کیلئے مرنے کی سبق اور ہمت دینے والی عوامی اجتماع یا ریلی پر بی بی سی کی اچانک ایک لہر گرتی ہے تو چند سیکنڈز کیلئے وہی اجتماع کی توار دور تک جاتی ہے باقی کچھ نہیں۔ غلامی انسانیت کو رسوا کر دینے والی شے ہے ہم غلامی کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں ہماری دشمن سے گلہ بے وقوفی ہوگی ہاں ہمیں گلہ کہیں یا اپیل وہ انسانیت کے دعویداروں اور انسانوں سے۔ آج اگر ہماری لاپتہ اور مسخ شدہ ڈھانچوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے انکی اصل اور سب سے بڑی مجرم اور زمہ دار سامراج اور ہماری دشمن ہے لیکن انسانوں کی خاموشی اور انسانیت کے نام پر بنے تنظیموں کی خاموشی کی وجہ سے بھی ہماری اغواء نما قتل و مسخ کرنے کی فہرست بڑھتا جا رہا ہے اور دشمن کو موقع دے رہا ہے۔ ہمیں آج بھی یقین ہے کہ دنیا میں انسانیت کے خدمت گار لوگ کہیں نہ کہیں رہتے ہیں اور درد بھی رکھتے ہیں انسانوں کیلئے۔ ہمیں دنیا کے انسانوں سے اپیل ہے کہ وہ ہماری انسانی حقوق کی بحالی والی آواز میں آواز ملا کر ہماری آواز کو بلند کریں سروں کی قربانی ہم خود دیتے آ رہے ہیں سامراج کے مقابلے میں۔ اور انسانیت کے نام پر بنے تنظیموں سے ہمیں شکواہ ہے کہ وہ کیوں ہماری قربانیوں کی طرف نہیں دیکھتے اور ہماری بات کو نہیں سنتے ہم پر ظلم جبر کرنے والوں کو نہیں روکتے۔ اور وہ خود ہی اپنی تنظیموں کی آئین میں شامل شقوں کی پاسداری نہیں کرتے۔ آج ہمارے ہاں ہماری دشمن دنیا کے تمام انسانی

حقوق کے اصولوں کو پامال کررہا ہے وہ بھی جانتے ہیں مگر اسکے باوجود کیوں خاموش ہیں۔ان کا مقصد دنیا میں گھوم کر یا اپنا نمائندہ رکھ کر انسانی حقوق کے پامالی کرنے والوں پر پریشر ڈالنا ہے اور انسانیت کا خدمت کرنا ہے۔وہ کونسی وجوہات ہیں کہ انکے نمائندے ہمارے ہاں نہیں پہنچتے ہیں۔ہاں ایک بات ہے شاید تمام تنظیموں کو پتہ ہی نہیں کہ ہے ایک خطہ جسے بلوچستان کہتے ہیں جو انہی تنظیموں کی آئین میں شامل انسانیت کے خدمت والی شقوں پر عمل پیرا ہوکر اپنی اولادوں کو قربان کرتا آرہا ہے۔اور انسانی خون سے سرخ ہو چکا ہے۔حالانکہ خود سرخ زمین نہیں ہے بلکہ کالی پتھروں اور سرسبز وشاداب خطہ ہے۔میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ سب تنظیمیں اس وقت تک کچھ نہیں کرتے کسی کے حقوق کیلئے جب تک مظلوم خود کچھ نہ کرے اور نہ مرے۔لیکن ہم نے جدوجہد کرکے حقوق حاصل کرنے کیلئے کئی سالوں سے مرتے آرہے ہیں اور مرنے کی شرط کو بھی پورا کررہے ہیں۔پھر بھی خاموشی ہے خود ہی انسانی حقوق کے تنظیموں کا پیغام ہے کہ ہر کوئی جہاں بھی انسانی حقوق کو پامال ہوتے دیکھتا ہے تو اسکی رپورٹ کریں تاکہ وہ وہاں پہنچ جائیں۔ہم نے یہ بھی کررہے ہیں جسکی مثال ماما قدیر کی ٹیم وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز اور بی ایچ آر او سمیت دوسری بلوچ تنظیمیں، پارٹیوں کی روزانہ احتجاج اور مظاہرے، ادیبوں اور رائیٹروں کی کالم اور آرٹیکلز ہیں۔ہم مختلف طریقوں سے اپنے خطے پر سامراج کے ہاتھوں انسانیت کی رسوائی کے تمام داستانوں سے آگاہ کرتے آرہے ہیں۔جسکی سب سے بڑی مثال وائس فار بلوچ مسنگ پرسن کے مختلف قسم کے احتجاج ہیں جنہوں نے ماما قدیر کی سربرائی میں 2009ء سے بھوک ہڑتالی کیمپ لگا کر انسانیت کیلئے انوکھا کام سرانجام دے رہے ہیں۔آج تک کیمپ روزانہ لگتا ہے اور مسخ شدہ لاش کے گرنے یا کسی کے اغواء پر مظاہرہ کرتے ہیں اور روزانہ پریس ریلیز بھی جاری کرتے ہیں۔بھوک ہڑتالی کیمپ کی عالمی ریکارڈ توڑ بھی چکے ہیں۔اور ہر قسم کی تکالیف برداشت بھی کررہے ہیں اپنے لئے نہیں، اپنا پیٹ پالنے کیلئے نہیں بلکہ انسانیت کو رسوائی سے بچانے کیلئے اور انسانوں کو آگاہ کرکے انسانوں کی مدد اور ان سے ہمدردی کیلئے۔چار سالوں میں بھوک ہڑتال اور ہر قسم کی تکالیف برداشت کرکے مایوس یا تھک کے اپنی انسانیت کی خدمت والی کام کو بند کرنے کے بجائے انھوں نے تو حیران کن کام کرکے ایک اور عالمی ریکارڈ بنایا وہ بھی انسانیت کی خوشحالی کیلئے۔وہ بلوچ ماں، بہنوں اور بچوں کے ساتھ پہلے صرف پریس کلبوں کے سامنے بھوک سے بیٹھتے اور صحافیوں کو روز بتاتے کہ ہماری آواز کو اپنی قلم اور کیمرے کی آنکھ سے دنیا کو پہنچاؤ لیکن پتہ نہیں وہ کونسی تیکنیکی مسائل ہیں صحافیوں کے کیمروں میں کوریج کے بعد خود بخود ماما کی کہی باتیں اور نعرے ڈلیٹ ہوجاتے ہیں۔اور دنیا تک نہیں پہنچ رہے ہیں۔جب فون پر ماما کو کسی دوست سے پیدل لانگ مارچ کے متعلق مشورہ لینے کی باتیں کرتے سُنا تو میں حیران ہوگیا کہ کوئٹہ سے کراچی تک کس طرح 70 سالہ اور ایکسیڈنٹ میں معذور ہوجانے والے ماما اور انکی ہمراہ ماں، بہن اور بچے پیدل جاسکتے ہیں۔لیکن جب 27 کتوبر کو کوئٹہ سے نکلنے اور راستے میں سفر کے دوران رابطے اور ماما، فرزانہ، بی بی گل سمیت انکے دوستوں کی بیان اور باتوں اور ہمت کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ 22 نومبر کو ماما بہت بڑے قافلے کے ساتھ پرجوش نعروں، بلوچ ماں، بہنوں کے ساتھ کراچی پریس کلب پہنچی تو مجھے برائن ٹریسی کی وہ باتیں یاد آگئی کہ ''حوصلہ اور عزم ایک ایسی خوبی ہے جو انسان کو ہر اس جگہ عمل کرنے پر اکساتی ہے جہاں اسے عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے''۔اسی طرح ماما اور اسکے ہمراہ فرزانہ مجید، بی بی گل، فضیلہ اور دوسروں نے اسی عمل کو جو کہ تکالیف، مشکلات اور خطرات سے بھرا پڑا تھا ضرورت سمجھا انسانی حقوق کیلئے اور انکی حوصلے اور عزم نے 780 کلومیٹر کے فاصلے کو تمام مشکلات، تکالیف اور خطرات کا مقابلہ کرنے کی طاقت دی اور انھوں نے یہ کام ایمانداری اور انسانیت سے دوستی کے جذبے سے کرکے پوری دنیا کو گاہ کرنے کی خاطر اور دنیا کیلئے پیغام چھوڑا کہ ہماری تکالیف اور مرمٹنے کا مقصد خود کو اور انسانیت کو زندہ کرنے کیلئے ہیں۔اور آؤ ہماری مدد کرو ہمیں بچاؤ، انسانیت کو بچاؤ۔ماما نے اپنی ٹیم کے ساتھ وہ کام کرکے دکھایا جسے آج تک کسی انسانی حقوق والی تنظیموں نے نہیں کیا ہے۔اور کرنے کی کوشش بھی نہیں کی ہے۔، ماما کا بھوک ہڑتال پر بیٹھنا اور پیدل مارچ کرنا تکلیف اور خطرات کا مقابلہ کرنے کا مقصد ہی انسانوں کو آگاہ کرنے کا ہے کہ آج بلوچ کس لئے مررہے ہیں اور کون کیوں مارہا ہے بلوچ کو۔انسانی حقوق کے تنظیمیں شاید اب بھی اپنی خاموشی نہ توڑیں لیکن ماما نے دنیا کے انسانوں خاص کر اپنی قوم کو جگا کر آگاہ کرنے کے ساتھ متحرک بھی کردیا۔ماما قدیر، فرزانہ مجید، بی بی گل اور نکی دوستوں نے بلوچ شہدا اور ہزاروں لاپتہ فرزندوں کے پیغام کو لاکھوں انسانوں تک پہنچایا۔26 دنوں کے سفر میں روزانہ لاکھوں کی حساب سے لوگوں نے سڑک کنارے جاتے ماما کے قافلے سے بلوچ شہداء اور لاپتہ فرزندوں کی قربانیوں کا پیغام لیکر پھر لوگوں میں بانٹتے رہے۔حتیٰ کہ دشمن کی آنکھوں سے ہوتا ہوا ماما کچھ ایسی جگہوں کو انسانیت کیلئے مہر و دوستی

اور بلوچ شہداء کی قربانیوں کے پیغام سے بھرا دیا جہاں دشمن کے پالے ہوئے انسانیت کے قاتل اور انسانی خون خواروں کا ہی راج کچھ وقتوں کیلئے چل رہا ہے۔ ماما زندہ ہے انسانیت کی خدمت کیلئے۔ انکی انسانی جذبے زندہ ہیں۔ انسانی نسل نے اشرف المخلوقات کا لقب پا چکا ہے لیکن ہر شخص اشرف نہیں ہوتا اشرف صرف انسان ہوتے ہیں ماما انسان ہے انسان کبھی بھی موت سے نہیں ڈرتا وہ جانتا ہے کہ موت لازمی ہے ایک دن آئے گا۔ ماما اور انکی ٹیم میں بلوچ خطے پر انسانیت کیلئے اپنی جانوں کی قربانی دینے والے بلوچ شہداء اور لاپتہ فرزندوں کی ہمت ہے ان میں انسانیت کا درد ہے۔ ماما قدیر جیسے انسانوں نے اپنی حوصلوں اور قربانیوں سے دنیا کو نیک نام دی ہے۔ انسانیت کو بچایا ہے وگرنہ انسانیت کب کا سامراجوں کے ہاتھوں مر چکا ہوتا۔ ماما کی ہمت اور حوصلوں نے اپنے ہمسفروں کو بھی حوصلہ دے کر دنیا میں انوکھا اور حیران کن کیا۔ بہن فرزانہ مجید خود کہتی ہے کہ جب تھوڑا تھوڑا تھکاوٹ یا تکلیف ہم محسوس کرتے ہم ماما کو دیکھ کر سب بھول جاتے اور ماما بھی اکثر کہتا رہتا کہ پاؤں تو چالے ہیں چلنے میں اور منزلوں تک انسانوں کو حوصلے اور عزم لے جاتے ہیں۔ 10 سالہ حیدر علی کا اگر میں ذکر نہ کروں تو انکے اور انسانیت کے ساتھ زیادتی ہوگی 10 سالہ حیدر علی نے بھی انسانیت کی خاطر 780 کلومیٹر ٹرالی چلانے کا ریکارڈ قائم کر دیا حالانکہ انکی نیّت صرف انسانوں کو جگا کر آگاہ کرنے کا تھا ریکارڈ بنانے کا نہیں مگر تاریخ رقم کر لیا ریکارڈ انکی پاؤں کو جھولی میں لے گئی۔ بی بی گل، فرزانہ مجید، فضیلہ بلوچ، سمی بلوچ سمیت وہ تمام لوگ جو ماما کے ساتھ تھے سب کے سب سلام پیش کرنے کے حق دار ہیں کیونکہ انھوں نے یہ سب تکالیف انسانوں کیلئے اور انسانوں پر ظلم و جبر ہونے کو دنیا کو آگاہ کرنے کیلئے برداشت کئے ہیں۔ لانگ مارچ کو ماما نے کراچی پریس کلب پہنچا کر دم نہیں لیا بلکہ اپنی عمل کو جاری کرتے ہوئے پریس کلب کے سامنے بھوک ہڑتالی کیمپ لگا کر کے فرزانہ، بی بی گل اور اپنی دوستوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔

10 دسمبر کو ہر سال پوری دنیا انسانی حقوق کے عالمی دن کے طور پر مناتی ہے اسی دن انسانیت کے نام پر بنائے گئے تنظیمیں مختلف پروگرامز، سیمینارز وغیرہ کرتے ہیں انسانی حقوق کے مطلق پوری دنیا کے لوگوں کو علم و آگاہی دیتے ہیں اور لوگوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ انسانی حقوق کی پاسداری کی جائے اور پامال نہ کئے جائیں اور پامال کرنے والوں کو سزا دینے کی قرار دادیں بھی پیش و پاس کرتے ہیں۔ دوسری طرف اکثر سامراج بھی دنیا والوں کو دھوکہ اور اپنی انسانیت دشمن کرتوں کو چھپانے کیلئے پروگرامز کرتے رہتے ہیں ہر سال۔

لیکن بدبختی سب سے بڑی یہی ہے کہ انسانی حقوق کے نام پر بنائے گئے تنظیمیں انکی چالوں میں آکر انکے پروگرومز اور باتوں پر جاتے ہیں۔ انکو پتہ ضرور ہوگا کہ بُرا کبھی بھی اپنے کو بُرا نہیں کہتا۔ اس سے پہلے اس طرح ہوتا رہا ہے۔ 10 دسمبر کے دن ہمارے لیے۔ مظلوم اور انسانیت کیلئے رضا کارانہ طور پر کام کرنے والے بلوچ فرزندوں اور تنظیموں کو کبھی بھی انسانی حقوق کے اداروں نے اپنے پروگرامز میں مدعو نہیں کیا ہے اور نہ ہی انکی باتیں سنی ہیں اچھی یا انکی مدد کی ہے۔ دیکھتے ہیں اس مرتبہ 10 دسمبر کو انسانی حقوق کے عالمی دن کے موقع پر عالمی اداروں سمیت انسانیت دوست بلوچ قوم پر ظلم و جبر کو دنیا کو کہاں تک آگاہ کریں گے اور ماما کی ٹیم کا ساتھ دیں گے۔ لیکن ماما کا سفر جاری ہے۔۔۔۔ اور اب ماما نے پیدل مارچ کر کے اپنے بہت ساری ہمدرد بھی بنائے ہیں۔ آخر میں، میں یہ کہوں گا اگر دنیا چاہتی ہے کہ خطہ بلوچ پر قتل و غارت گری ختم ہو تو انہیں یہاں جنم لینے والے یا مسلے کا تحقیقات اچھی طرح کر کے اصل وجوہات کو ڈھونڈ کر اس مسلے کو غیر جانبداری کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے حل کر کے انسانیت کا خدمت کرنا ہوگا، وگرنہ بلوچ قوم اپنے انسانی اولین حق (آزادی) کیلئے اپنی قوم کے آخری فرد تک مرتا رہے گا۔ اور بلوچ مر ہی سکتا ہے صرف اپنی لئے باقی کام دنیا کے انسانوں کو کرنے ہیں۔

''اگر کوئی میرے لئے یہ تجویز رکھتا کہ جاؤ تمہیں تعلیم مل سکتی ہے بشرطیکہ تم ہر ہفتے چوک میں درے کھانے کیلئے تیار ہو میں خوشی سے تجویز کو مان لیتا''

☆☆((((میکسم گورکی))))☆☆

افسانہ: جڑواں بھائی بہن

ہوتمان بلوچ

ویتنام کے ایک گاؤں کے ایک گھر میں دو بچے جڑواں پیدا ہوئے، جڑواں بچوں میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ انکے پیدا ہونے سے پہلے انکے باپ تین مہینے پہلے مر چکا تھا۔ انکی خواہش تھی کہ وہ اپنے ہونے والے بچے کو دیکھ سکے، مگر ایسا نہ ہوسکا ایک بچے کی پیدائش کا انتظار کرنے والا باپ اپنے دو بچوں کی دیدار نہ کر سکے۔

والدہ دونوں بچوں کی پیدائش پر زیادہ خوش تھی، اُس نے بیٹی کی نام روئی اور بیٹے کا نام برگیڈ رکھا۔ انکے والدہ اس لیے خوش تھی کہ انکی بچے اُس وقت پیدا ہوئے جو انہیں نے بڑھاپے کی زندگی میں قدم رکھی تھی، بچوں کی پیدائش کی خوشی اس نے شوہر کے بھی غم بھلا دیئے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب بچے انکی بڑھاپے کا سہارا بنیں گے، والدہ نے دن رات محنت کر کے اپنی بچوں کو پال کر بڑا کر دیا۔

جب برگیڈ اور روئی دس سال کے ہوگئے تو اس وقت ویت نام کے حالات بھی زیادہ خراب ہونا شروع ہوگئے۔ قبضہ گیر دشمن نے ویتناموں پر اس طرح کے ظلم ڈھانا شروع کر دیا جس کی مثال تاریخ میں شاہد ہی ملتی ہو۔ اب انکے والدہ کو ایک ڈر محسوس ہونے لگی کہ انکی یہ بچے بھی ان حالات کی لپیٹ میں نہ آجائیں اور دشمن کے ٹارچر سیلوں میں نہ رہیں جو آج کل ہر ویتنامی نوجوان ریاستی اذیت گاہوں میں اذیت سہہ رہے ہیں وہ نوجوانوں کو شہید کر کے انکے لاشوں کو گاڑیوں کے پیچھے باندھ کر شہروں اور گلی کوچوں میں گھسیٹتے لے جاتے تھے۔ یہ حالات ہر ماں کے لئے بھی قیامت سے کم نہ ہوتی جو دشمن کو اپنی لخت جگر کو مارتے گھسیٹتے جاتے دیکھیں، ایک ماں کیلئے یہ بھی شاہد چھوٹی غم نہ تھی جب اسکی نوجوان بیٹے یا بیٹی کو انکی آنکھوں کے سامنے خنجروں کی وار سے مارتے تڑپتے مرتے دیکھیں۔۔۔ لیکن کر بھی کیا کر سکتے ہے؟ وہ حالات ہی ایسے تھے کہ وہ اپنی بچوں کی لاشوں کو دیکھ کر خود ہی مر سکتی تھیں، یہ پورے ویت نامی ماہوں کے لئے خود ہی ایک بڑی اذیت سے کم نہ تھی۔۔۔۔۔۔۔

یہ ہر والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو پال کر جوان کرے، انکی زندگی کے بارے میں سوچیں اور انہیں ایک ایسے مقام تک لے جائیں کہ وہ اپنی زندگی کو اپنے خواہشات کے مطابق خود بسر کریں، پھر وہ اپنے بوڑے والدین کے لئے ایک سہارا بن جائیں۔ مگر ویتنامی والدین یہ سوچ نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ اپنی نوجوانوں کی لاشوں کو خود کندھے دے کر تھک چکے تھے۔ برگیڈ اور روئی کی ماں یہ سب سوچ کر برداشت نہ کر سکی کہ اُسے اپنی ہی بچوں کی لاشوں کو دیکھنا پڑے۔

ایک صبح ہی برگیڈ نے اٹھ کر دیکھا کہ اُسکی ماں ابھی تک سوئی ہوئی تھی یہ پہلی صبح تھی کہ وہ اتنی دیر تک سو رہی تھی، اُس نے سوچا شاہد آج ماں کی طبیعت خراب ہوگی اس لیے ابھی تک سو رہی ہے۔ برگیڈ نے اپنی بہن روئی کو جگایا اور ماں کو جگانے کیلئے اُسکی پاس گئے، مگر ماں رات بھر میں ویتنامی ظلم و جبر اور اپنی بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچتے سوچتے ایک ایسی نیند میں جا چکی تھی کہ اب اُس کو جگانا ناممکن تھی۔ دونوں جڑواں بہن بھائی کو اپنی ماں کی فوتگی پر بہت صدمہ ہوا، انکے ماں ہر وقت انہیں کہتی تھی کہ میری علاوہ تمھارے ایک اور بھی ماں ہے اُسکی بھی قدر کرنا۔

ماں کی مرنے کے بعد برگیڈ اور روئی دونوں جڑواں اب گھر میں اکیلے تھے برگیڈ ہر صبح کام کیلئے شہر جاتا اور شام کو واپس گھر لوٹتا یہ اسکی ڈیلی روٹین تھی۔ صبح گھر سے نکلتے ہی انکی بہن شام کو آنے تک ان کیلئے دعا گو ہوتی تھی دن کی کمائی سے صرف رات کیلئے انکی چولہا جلتی تھی۔ کبھی کبھار شہر میں حالت خراب ہوتے یا کوئی ہڑتال کے باعث کئی رات وہ کچھ کھائے بغیر گزارتے تھے۔ شہر میں روزانہ شورش بڑھتی گئی پورے ویتنام ایک جنگی منظر پیش کر رہا تھا روزانہ لوگوں کو اُٹھانا اور انکے لاشیں پھنکنا روز کی معمول بن چکی تھی پورے ویتنام میں ریاستی فوجی آپریشن جاری تھا۔

ایک دن ریاستی فوج برگیڈ کے گھر میں گھس گئے اُس وقت صرف اُسکی بہن گھر میں اکیلی بیٹھی تھی وہ خود کام کے سلسلے میں شہر جا چکا تھا۔ فوجیوں کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر روئی بہت خوفزدہ ہوئی۔ ایک لمبا فوجی جو کہ بڑا بوٹ اور فوجی ہیٹ پہنا تھا روئی کے پاس آکر کہا: کدھر ہے تمھاری جڑواوہ بھائی؟؟؟؟؟

روئی نے ڈرتے ہوئے کہی: بھائی۔۔۔ بھائی وہ تو کام کے لیے شہر گیا ہے۔

فوجی نے زور سے چلایا: نہیں۔۔۔ بکواس بند کرو جڑوا!! وہ کام کیلئے شہر نہیں گیا ہے

۔سچ بتا کہاں ہوگا؟؟؟؟

روئی نے رونے کے ساتھ جواب دی: تو پھر کہاں ہوگا وہ مجھے پتہ نہیں۔

فوجی نے اُسے بالوں سے پکڑ کر کہا: وہ ایک باغی ہے۔ پھر اُس پر خوب تشدد کیا اور مار مار کے بے ہوش کردی۔

شام کو برگیڈ گھر لوٹا تو اُس نے خون سے رنگین بے ہوش روئی کو فرش پر پڑی دیکھکر پاگل جیسے ہوگئے۔ جلدی مٹکے سے پانی نکال کر اُسکی چہرے کو دھو کر اُٹھایا اور جلدی سے مقامی ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈریپ اور انجکشن لگانے کے بعد آخر وہ ہوش میں آگئی اُسے ہوش میں آتے ہوئے دیکھ کر برگیڈ بہت خوش ہوا اور روئی سے ان سب ہونے کی وجہ پوچھی، اُس نے وہ سب کچھ بتائی جو اُس پر گزری تھی۔

برگیڈ نے سوچا شاہد ویتنام میں اب کوئی ایسا گھر نہیں بچا ہو جو ریاست کی ظلم وستم سے محفوظ ہو اب اسکے بیٹھے ہوئے دل کی نفرت مزید بڑھ گئی۔ وہ دشمن سے ضرور اپنے بہن کی بدلہ لینا چاہتا تھا پہلے وہ باغی نہیں تھے مگر اب دشمن نے خود اُسے ایک باغی بنایا پہلے وہ ایک مزدور بن کر شہر کو مزدوری کرنے کیلئے جاتا تھا مگر اب وہ ایک باغی بن کر شہر جاتے اور شام کو گھر واپس لوٹتا۔ لیکن اُسکی بہن روئی کو پتہ نہ تھی کہ اب وہ باغی بن چکا ہے۔

ایک شام برگیڈ نے گھر آنے میں دیر کردی تو بہن روئی بہت پریشان ہوئی بھائی کے انتظار میں بیٹھ کر سوچنے لگی کہ آج وہ کیوں دیر کر رہا ہے اُسکی سمجھ میں کچھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کریں۔ آخر رات ہونے لگی لیکن آس پاس برگیڈ کی کوئی نام ونشان نہ تھا تو روئی بہت پریشان تھی وہ خوف محسوس کر رہی تھی اُس نے پورے رات بغیر سوئے گزاری لیکن بھائی کا کوئی حال نہ تھا۔ پھر اُسے گاؤں سے پتہ چلا کہ کل شام برگیڈ شہر سے گھر آتے ہوئے راستے سے فوجیوں نے اُٹھا کر لاپتہ کردیا۔ یہ حال سننے کے بعد روئی بے ہوش ہوگئی یہ بات سننا گھر میں ایک اکیلے بہن کے لئے کیسی دردناک ہوگی؟؟؟؟؟؟؟

اس درد کو صرف وہ بہن جانتی ہوگی جو یہ عمل اُس پر گزرا ہو یا کہ گزر رہا ہو۔ بھائی کی اغوا کے بعد روئی نے نہ کھانا کھایا نہ ہی رات کو سوسکا وہ اپنی حواس کھو چکی تھی وہ گھر میں دروازے کے پاس بیٹھ گئی اور برگیڈ کی آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ برگیڈ اُدھر دشمن کے اذیت گاہوں میں ایسے اذیت سہہ رہے تھے کہ ان کو بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ اور اِدھر ایک بہن کی اذیت بھی کم نہ تھی جو اُسکی اکلوتا جڑوا بھائی کو اغوا کر کے گھر میں اُسے اکیلا کر دیا بھائی کے غم سے وہ پاگل ہوچکی تھی۔

ایک ہفتے کے بعد اب بھی دروازے کے پاس بیٹھی ہوئی روئی اپنی بھائی کی انتظار میں تھی کہ لوگوں کا چھوٹا ہجوم گھر کی طرف آتے ہوئے دیکھی۔ وہ دل میں خوش تھی کے شاہد بھائی بازیاب ہوکر لوگ ایسے گھر لے آرہے ہیں وہ سوچ رہی تھی کہ برگیڈ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگا اس لئے لوگ اُسے اُٹھا رکھے ہوئے ہیں۔ جب ہجوم گھر کے سامنے پہنچ کر برگیڈ کی لاش کو زمین پر رکھا اور گاؤں کے باقی لوگوں کو بلانے لگے سامنے بھائی کی مردہ لاش کو دیکھ کر وہ پاگل جیسی اُس پر چمٹ کر بوسا دینے لگی اور اس سے بات کر رہی تھی۔ بھائی کے زندہ آنے کی انتظار کرنے والی بہن کے سامنے اُسکا مردہ لاش پڑا تھا جو دشمن نے شہید کر چکا تھا۔ گاؤں کے سہارے لوگ جمع ہو چکے تھے روئی کو لاش سے دور کرنے کے لیے اُسے پکڑا گیا مگر وہ لاش سے چمٹی ہوئی تھی بھائی کے ساتھ وہ بھی اس دنیا سے چلی گئی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دونوں جڑواں بہن بھائی ایک ساتھ اس دنیا میں آئے ایک ہی دشمن سے ایک جیسی اذیت برداشت کی اور ایک ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

”ساری زندگی اپنے لئے گزار کر خوشی نہیں ملتی خوشی ملتی ہے تو اس وقت جب دوسروں کیلئے جینا شروع کروگے“

☆☆ ٹالسٹائی ☆☆

انقلابی تحریکیں ،آزمائشیں اور قومی جذبے

لکمیر بلوچ

ظلم جبر سماجی وسیاسی اور قومی غلامی کے خلاف تحریکیں جہاں بھی جنم لیتی ہیں تو شروع میں وہ انتہائی کمزور ہوتی اور ان کے پاس عوامی طاقت وحمایت کی فقدان وسائل کی کمی ہوتی ہے اور بہت سی ضروریات ہوتے ہیں جو شروع میں کافی مشکلات پیدا کر سکتے ہیں مگر اس کے باوجود آہستہ آہستہ جب تحریک منظّم اور طاقت ور بنتی ہے، تو اپنی قوم کو منظّم کرنی کی جدوجہد کرتے ہیں کیونکہ ان کو اس بات کا ادراک اچھی طرح سے ہے کہ ایک طاقت ور اور منظّم دشمن کے خلاف جنگ میں اُسی صورت کا میابی مل سکتی ہے کہ پوری قوم کو منظّم کر کے اس تحرک کیلئے عوامی حمایت حاصل کی جاسکے عوام کے اندر رہتے ہوئے عوامی مفادات کی تحفظ کی جائے تا کہ عوام کو یہ باور کرایا جاسکے یہ جدوجہد ان کی اپنی جدوجہد ہے اور ان ہی کیلئے ہے

دنیا میں جہاں بھی قومی غلامی کے خلاف جتنی بھی تحریکیں چلی ہیں، ان کی شروعات انتہائی کم لوگوں سے ہوئی ہے، کچھ لوگوں نے قومی آزادی وقومی غلامی اور ظالم و مظلوم کے درمیان رشتے کو جان کر اپنی قومی بقاء کو خطرے میں دیکھ کر جدوجہد کا آغاز کر کے عوامی مفادات کے تابع رہتے ہوئے گھر گھر جا کر قومی آزادی کا احساس دلایا اسطرح غلامی کے خلاف درس دیکر عوام کو یہ باور کرایا، کہ ہم نے جو جدجہد شروع کی ہے یا ہمارے بہت سے جہدکار اس فکر کو لے کر آزادی کی جنگ میں شہید ہو چکے ہیں ہم سب کا مقصد صرف ایک ہے کہ ہم ایک سرزمین کے مالک رہیں، ہماری اپنی ایک پہچان رہے ہماری زمین کو قبضہ کر کے کالونی بنا چکے ہیں اور ہم آزادی کی بحالی اور سرزمین کے مالک بننے کیلئے ظلم وجبر ناانصافی کے خلاف اپنی قوم اور آنے والے نسلوں کو اس ذلت آمیز زندگی جو ہم گزار رہے ہیں اس زندگی سے انہیں محفوظ بنا سکیں ایسا نہ ہو کہ ہم سب کی طرح آنے والی نسلیں، اپنی زبان، قوم، کلچر اور سرزمین سے بیگانہ رہ کر سامراجی استحصالی نظام کو برقرار رکھیں،

ہم سب کا مقصد یہی ہے، اپنی قومی بقاء کی حفاظت کی خاطر قابض کے خلاف جد وجہد کا حصہ بنیں، اس کے بغیر کوئی حل نہیں ہے، ایسا کوئی کام نہیں کریں گے جس سے قومی تحریک اور عوامی مفادات کو نقصان پہنچے اسی جذبے تحت قومی آزادی کے کاروان عوامی حمایت حاصل کرتا رہے گا تو کامیابی خود بخود ہمارے پاؤں چوم لیتی ہے،

جب غلام اور محکوم قوم کے نوجوان اُس تحریک کو اپنا لیتی ہے تو اسے یہ معلوم ہوگا کہ جی یہ جنگ میں جو جہدکار تکالیف برداشت کر رہی ہیں یا اپنی جانیں نچاور کر رہی ہیں یہ تو سب ہمارے ہی قومی مفادات کی خاطر دے رہے ہیں پھر ہم کیوں دیگر جہدکاروں کی طرح اس جہد کو اپنا نہ سمجھیں یہاں جب اس تحریک کو عوامی حمایت حاصل ہوتی ہے تو قبضہ گیر کی نیندیں حرام ہو جاتی ہے قابض فورسز ہر 100 کلومیٹر پر ایک چیک پوسٹ لگا کر کہتی ہے، کہ علاقے سے شدت پسندوں کی رٹ ختم کر چکے ہیں، اپنی رٹ قائم کر چکے ہیں مگر آزادی پسندوں کیلئے ہر گدان ہر گھر ہر درخت اور پہاڑ سب آزادی پسندوں کے چوکی ہیں، جو دشمن سے تحفظ فراہم کرتے ہیں

بلوچستان میں اس وقت قابض کے خلاف ایک جنگ کا آغاز ہو چکی ہے جو گزشتہ 65 سالوں سے مختلف مراحلوں سے گزرتے ہوئے بلوچ عوام میں قومی محکومی کے خلاف آگاہی دیتے ہوئے سینکڑوں نوجوان مرد خواتین اور بزرگ اپنی جانیں قربان کرتے ہوئے شہادت کا عظیم رتبہ پا کر امر ہو چکے ہیں اور 19 ہزار سے زائد بلوچ سیاسی کارکنان قومی آزادی جیسے عظیم مقصد کی خاطر اپنی زاتی خواہشات گھر بار کو بالائے تاک رکھ کر غیر انسانی اذیتیں برداشت کر رہے ہیں

آزادی کی تحریکیں عوامی سپورٹ کے ساتھ قابض کے تمام حربوں کو ناکام بنا دیا جاتا ہے آزادی کے جہدکار اور مہم جوہ کے درمیاں فرق یہی ہے، کہ آزادی کے جہدکار کو قومی آزادی کے تحریک کے ساتھ شامل ہونے سے پہلے اپنی قوم وسرزمین سے قول کر کے اس عزم کے ساتھ کہ آزادی پانے کیلئے وہ مر مٹنے پر تیار رہتا ہے اسے پہلے سے ہی معلوم ہے کہ اس راہ میں ہر قسم کے سخت سے سخت ترین مشکلات سامنے آئیں گے، وہ ان کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے، وہ اپنی جد وجہد کو دنیا کے سطح پر متعارف کراتے ہیں، تو قبضہ گیر حسبِ روایت اپنے مقامی گماشتوں کے ذریعے دنیا کو گمراہ کرنے کیلئے اور اپنی لوٹ کھسوٹ کو جائز قرار دینے کی تگ دو شروع کر دیتی ہے کہ یہاں پر کوئی آزادی کی تحریک نہیں چل رہی یہ

بھٹکے ہوئے کچھ لوگ ہیں یہ مُٹھی بھر عناصر ہیں اور پتہ نہیں کون کون سے لقب سے دنیا کو گمراہ کرنے اور اپنی نو آبادیاتی نظام کو دوام دینے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں مگر آزادی پسند بلوچ سیاسی ومزاحمتی پارٹیاں مقامی گماشتوں کے چہروں کو بلوچ عوام کے سامنے بے نقاب کر چکے ہیں پارلیمنٹیرین تو بلوچ آزادی پسندوں کو مہم جو کہتے ہیں کہ یہ آزادی کیسے حاصل کرلینگے، میں یہاں ایک بات واضح کرتا چلوں کہ مہم جو وہ ہوتے ہیں جو مقصد ونظریہ کے بغیر سوچے سمجھے کوئی کام کو شروع کرتے ہیں اور انکو پتہ بھی نہیں ہوتا جس کام کو میں شروع کر رہا ہوں راستے میں کیا کیا مشکلات آئیں گے اور کام کرتے ہوئے تھوڑی سی تکالیف اور مصیبتیں جھیل کر تھک جاتے اور جدوجہد چھوڑ کر جاتے ہیں لیکن قومی آزادی کے جہد کار ایک مقصد اور نظریاتی ہتھیاروں سے لیس ہوتی ہے اور اسے پتہ ہوتا ہے کہ جس راستے پر وہ جا رہے ہیں تکلیف ہی تکلیف ہے، ہر موڈ پر زندگی وموت کا رقص رہتا ہے مگر قومی جذ بے سے سرشار ہر قدم پر جہد کار ہر قسم کے مشکلات سہہ کر آگے بڑھتا جاتا ہے اور دشمن کی رٹ کو عوام کے دل سے اتارتا جاتا ہے اور قومیت کا درس پھیلاتا جاتا ہے بلوچ جدوجہد کو کاؤنٹر کرنے کیلئے پاکستانی ریاست ڈاکٹر مالک وحاصل اینڈ کمپنی اختر وثناء زہری اور بدنام زمانہ قاتل شفیق مینگل جیسے لوگوں کو بلوچ کے خلاف متحرک کر کے بلوچستان کا اسٹیک ہولڈر ظاہر کر رہا ہے مگر ہماری ایک کامیابی یہ ہے کہ کٹھ پتلی وزیراعلی مالک خود تسلیم کر چکے ہیں کہ بلوچستان کے بیشتر علاقوں میں سرکار کی رٹ مکمل ختم ہو چکی ہے ،،،،،اس حقیقت کو کون چھپا سکتا ہے۔۔۔۔دوسری طرف پاکستان بلدیاتی الیکشن کرانا چاہتا ہے دسمبر میں بلدیاتی الیکشن کو ڈرامہ رچایا جارہا ہے جس میں حسبِ روایت بی این پی مینگل نیشنل پارٹی ہ عوامی حصہ لیکر بلوچ قومی محکومی کو مضبوط کرنے کوشش کریں گے رہے ہیں ،اس الیکشن کا بھی بلوچ قوم 11 مئی کی طرح بائیکاٹ کر کے بلوچ آزادی کی جدوجہد کے ساتھ سچی وابستگی کا اظہار کریں گے،،، پاکستان کے سارے ادارے بلوچ کے دوست کبھی نہیں ہوتے چاہے ان اداروں میں بلوچ ہو، پنجابی ہو پشتون ہوں سب پاکستان سے پیسہ لیکر اپنی پیٹ بھرنے کیلئے ہر طرح کے کام کرتے ہیں۔ بلوچ قومی تاریخ میں سارے بلوچ جو پاکستانی اداروں کے ساتھ دیکر قومی غلامی کو مضبوط اور پیسہ کی خاطر بلوچ جہد کے خلاف کام کرر ہے ہیں ،ان کو بلوچ پہلے سے اپنا دشمن تصور کر چکا ہے ان کا انجام دنیا کے دیگر قوموں کے گماشتوں کی طرح ہوگی جسے تاریخ بھی غداری کا لقب دیتا ہے

کیونکہ تاریخ انتہائی بے رحم ہوتی ہے تاریخ سے ہم سب کو سبق سیکھنا چاہئے

انقلابی پارٹی کو اپنی تعلیم مکمل کرنی چاہیے۔ پارٹی نے حملہ کرنے کا فن تو بخوبی سیکھ لیا ہے.....لیکن اب اسے یہ علم بھی حاصل کرنا چاہیے پسپائی کہ صورت میں کم از کم نقصان اٹھاتے ہوئے مراجعت کیسے کی جاسکتی ہے۔ ہمیں اس امر کا احساس ہونا چاہیے کہ دشمن پر فتح پانا اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اس پر حملہ کرنے اور ضرورت کے وقت مراجعت کرنے کے صیح فن سے ہم پوری واقفیت حاصل نہیں کر لیتے۔۔

☆☆ لینن ☆☆

سرمچار شہید حامد براھیم

حیر یہ بلوچ

ہم کو پتہ نہیں تھا، کہ ہمارے علاقے ہیرونک میں بھی ایک بہادر سرمچار موجود ہے۔شہید حامد جو کہ کوئٹہ آئی ٹی یونیورسٹی کے طالب علم تھے، وہ شال سے ہیرونک میں پاکستانی الیکشن کے تین دن پہلے آئے تھے، اور ہمیں ووٹ نا دینے کو کہا اور باقی نزدیک گاؤں، میں بھی جا کر عوام کو الیکشن میں حصہ نا لینے کی تبلیغ کیا ، کہ اس الیکشن میں حصہ نہیں لیں کیونکہ ان الیکشن میں آپ حصہ نہیں لیتے تو ایک قومی فریضہ پورے کرتے بلوچ قوم کے سرزمین اس وقت پاکستان کے قبضہ میں ہیں آپ کا ایک ووٹ کس قدر غلامی کی ذنجیروں کو مضبوط کرے گا،

شہید حامد بلوچ نے اپنے ذاتی زندگی اور دیگر نوجوانوں کی طرح اپنے گھر بار کے بارے میں نہیں سوچتا، بلکہ ان کو صرف اپنے قوم کی فکر تھی، قومی عمل جا کر جام شہادت نوش کر گئے، کسی کو کیا پتہ، ایک جہدکار اپنی زندگی کس طرح گزرتا، ہر وقت گمنامی کی زندگی کب کس موڈ پر دشمن سے آمنے سامنے ہو کر عظیم مقصد کے قربان ہو جاتے ہیں تب وہ جا کر ہر ایک جانتا ہے وہ کس کام سے لگا ہوا تھا، ویسے کہ سرمچار کتنے تنگ ہیں، ان پہاڑوں میں وہ سردی، گرمی، بارش، طوفان کی کوئی پروا نہیں وہ ایک مقصد کے خاطر جو بلوچستان کی آزادی ہے۔

شہید حامد بلوچ نے مشکے سے گوریلا تربیت لی، مختلف محازوں پر جوان مردی کے ساتھ دشمن کے حلاف جنگ لڑی۔وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھے

کہ شاید میں اپنے علاقے ہیرونک کا پہلا شہید بن جاؤں، مگر اس وقت ہم ان کی بات کو سمجھ نا سکے، شہید کو سرمچار بنے 5 سال ہو چکا تھا لیکن ہم نہیں جانتے تھے کہ وہ سرمچاروں کے

ساتھ ہیں، وہ بی ایل ایف کے بہادر سرمچار ہیں۔

12 مئی کے دن پاکستانی الیکشن کے خاطر پاکستانی آرمی مدد سے مختلف علاقوں میں پولنگ کیلئے آرمی خود پولنگ ڈبے تربت سے ہوشاب کی طرف روانہ ہوئے تو شہید نے کونرک کے مقام پر اپنا مورچہ بنالیا تھا، جونہی آرمی وہاں سے گزری تو بلوچ سرمچاروں نے ان پر حملہ کر دیا، تاکہ وہ ووٹ کے ڈبوں نہ لیجاسکیں، 9 بج کر 35 منٹ پر بمب اور گولیوں کی آوازیں آنے لگیں، سرمچاروں نے بڑی بہادری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا اور دوڑتے دوڑتے ایک پہاڑ پر چڑھ گئے، سرمچاروں نے 15 فوجیوں کو ہلاک اور 2 گاڑیوں کو تباہ کیا، آرمی والے ان کو نہیں مار سکے، شہید حامد نے باقی سرمچاروں کو وہان سے نکل لی اور خود اکیلے 2 گھنٹے تک دوبدو ان سے جنگ جاری رکھا۔اور وہاں شہید کو دشمن کی گوئی لگنے حامد جان کو شہید ہو گے۔پھر پورے راستے میں شکست خوردہ فوج پاکستان زندہ باد اور بلوچستان مردہ باد کے نعرے لگاتی رہی جو اس کی شکست کا منہ بولتا ثبوت تھا۔تربت پہنچ کر فوج نے شہید حامد بلوچ کی لاش تربت لیویز کے حوالے کر دیا جسے بعد میں سول ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔اس وقت بھی ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ لاش حامد جان کی ہے، پھر کسی نے شہید حامد جان کی گھر فون کر یہ بتایا کہ آپ کے بیٹے شہید ہوئے ہیں ان کی لاش ہسپتال میں رکھی ہے آ کر لے جائیں، یہ سن کر سب حیران رہ گئے کہ حامد نے زندگی بھر کسی کو اُف تک نا کہا کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کی، وہ اس طرح کی بڑی جنگ کیسے لڑسکتا ہے؟

پھر شہید کی لاش کو بڑی احترام کے ساتھ لے آئیں اور رات 8 بجے ان کا جنازہ ہوا، بلوچ سرمچاروں ان کی شان میں سلامی پیش کی، پھر بی ایل ایف نے ان کی جرات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ 5 سالوں سے جنگ آزادی برسرپیکار تھا آور وہ ایک جانباز سرمچار تھے۔پھر ہمیں معلوم ہوا کہ شہید حامد کے دل میں اپنے قوم کے لئے جتنی محبت تھی تو دشمن کے لئے اتنی نفرت۔یہ گلزمین کی حقیقی محبت تھی جس نے حامد جان جیسے نوجوان کو ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا۔۔۔۔۔

”انصاف کے بغیر امن کی بات کرنا ظلم ھے“

﴿((((ارون دھتی رائے))))﴾

سلام فرزانہ مجید کو

صلاح الدین بلوچ

27 اکتوبر 2013 کو وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کی طرف کوئٹہ پریس کلب سے ایک لانگ مارچ شروع ہوا۔ اس لانگ مارچ کی پہلی منزل کراچی تھی۔ جسکی سربراہی وائس فار مسنگ پرسنز کی چیئرمین واجہ نصراللہ بلوچ اور وائس چیئرمین ماما قدیر بلوچ کررہے تھے۔ اس میں سیاسی و سماجی کارکناں شامل ہیں۔ اور بوڑھے، جوان، بچے اور عورتیں بھی تھیں۔ اس لانگ مارچ کے شروع ہونے سے پہلے پریس کلب میں ماما قدیر بلوچ نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے اس جدوجہد کو 4 سال سے زیادہ عرصہ ہورہا ہے لیکن بلوچ مسنگ پرسنز ریا ہونے کے بجائے، تشدد زدہ اور مشخ شُدہ لاشیں برآمد ہورہی ہیں اور روزانہ کئی بلوچ مسنگ ہورہے ہیں ان میں بچے، عورتیں اور بوڑھے بھی کافی تعداد میں ہیں تقریباً 18 ہزار کے قریب اور اس سے بھی زیادہ۔۔ کئی مرتبہ سپریم کورٹ نے بھی حکم دیا تھا کہ ان کو بازیاب کرایا جائے لیکن ان 4 سال میں کوئی پیشرفت سامنے نہیں آئی۔ اور آج ہم عالمی انسانی حقوق کے علمبردار تنظیموں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بلوچ قوم سے جو انسانیت سوز سلوک ہورہا ہے اُسے روکا جائے۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر اقوام متحدہ اقدام اُٹھائے۔ اور ہمارا یہ لانگ مارچ اپنی آخری منزل تک جارہی رہے گا۔ اس لانگ مارچ میں ایک نڈر اور بہادر بیٹی (بلوچ قوم کی بیٹی) جو فرزانہ مجید کے نام سے جانی جاتی ہیں، ماما قدیر بلوچ کے ہمراہ اسلام آباد کیلئے پیدل مارچ میں شریک ہیں۔ فرزانہ مجید بلوچ قوم کی معصوم اور نڈر بیٹیوں میں ایک ہیں جنہوں نے اپنی کم عمری میں آج دنیا اور دنیا کے تمام عورتوں کو پیغام دی ہے کہ غیرت اور بہادری کیا ہوتی ہے، فرزنہ مجید نے نہ صرف بلوچ قومی تحریک کو ایک نئی قوت دی ہے بلکہ آج دشمن کو بھی یہ دکھایا کہ بلوچ قوم کی بیٹیاں نڈر اور غیرت مند ہیں تو اپنے بقا کیلئے ہر محاز پر جدوجہد کیلئے تیار ہیں۔ اگر ذاکر مجید 4 سالوں سے دشمن کے قید و بند میں اسیر ہیں اور دشمن نے یہ سوچا ہے کہ ذاکر مجید کو اذیتیں دیکر اور انہیں پابند سلاسل رکھ کر قومی فکر کو ختم کیا جائے گا تو یہ ان کی بھول ہے۔ کیونکہ آج بہن فرزانہ مجید بلوچ نے دشمن کو یہ دیکھادی ہے کہ وہ ذاکر مجید کی بہن اور بلوچ قوم کی بیٹی ہے۔ اور ان کی ہمت، حوصلہ اور بہادری کو دیکھ، پھر اس قوم کو ختم کرنے کی سوچ۔ آج فرزانہ مجید کی اس لانگ مارچ سے بلوچ قوم میں ایک نئی انقلابی جذبہ، شعورِ آگاہی برپا ہوگئی ہے اور بلوچ قوم نے ہر جگہ اس لانگ مارچ کا پُر جوش استقبال کرکے یہ باور کرایا ہے، کہ بلوچ قوم کا ہر فرزند آزادی پسند ہے، آج بلوچ قوم میں شعور آچکی ہے۔ کیونکہ فرزانہ مجید بلوچ یہ نہیں دیکھتی کہ اُن کے پھیروں میں شدید درد ہورہی ہے، یا پاؤں زخمی ہیں، بلکہ انہیں حق و انصاف کا بول بالا کرنے کی راہ میں سفر کرکے خوشی ہورہی ہے، حوصلہ بلند سے بلندتر رہے ہیں اور اپنے مقصد کے حصول کیلئے بیتاب ہیں۔ فرزانہ مجید کی اس حوصلہ اور بہادری کو دیکھ کر ہر بلوچ میں قومی جذبہ پیدا ہوا ہے۔ جیسا کہ ایک معصوم بچہ علی حیدر بلوچ نے بتایا میں نے دیکھا کہ میری بہن فرزانہ مجید اس لانگ مارچ میں شریک ہیں جو کوئٹہ سے کراچی اور اب اسلام آباد جارہی ہیں۔ آیا علی حیدر بلوچ (بلوچ فرزند) میں اتنی غیرت نہیں کہ وہ اپنی بہن فرزنہ مجید اور پیر مرد ماما قدیر بلوچ کے ہمراہ ہوجائے۔ (علی حیدر بلوچ کوئٹہ سے لانگ مارچ میں شریک ہیں)۔ فرزانہ مجید بلوچ کی اس لانگ مارچ نے ہزاروں علی حیدر (بلوچ فرزندوں) کے جذبات کو جگا یا ہے۔ آج دنیا آج تک اتنی بڑی لانگ مارچ نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی دنیا میں کوئی ایسی بہادر عورت ہے جس نے اتنی بڑی لانگ مارچ میں اتنی جُرات و بہادری کا مظاہرہ کیا ہو، فرزانہ مجید دُنیا میں پہلی عورت ہیں جو 2200 کلومیٹر پیدل لانگ مارچ کررہی ہیں، دشمن کے دھمکیوں کے باوجود اس نے خوف کو ٹھکرا کر اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہیں۔ دشمن کے کئی حملوں کے باوجود فرزانہ مجید بلوچ اور ماما قدیر بلوچ، دیگر بلوچ فرزندوں کو ساتھ لیکر منزل کی طرف گامزن ہیں۔ سلام پیش کرتا ہوں فرزانہ مجید اور پیر مرد ماما قدیر بلوچ کی جذبات، ہمت، غیرت اور بہادری کو۔۔۔۔

ایک ہنستا مُسکراتا چھرہ جو جسمانی طور پر ہم سے بچھڑ گیا

شپ چراگ بلوچ

جدوجہد کیا ہے؟ کب اور کسے کیا جاتا ہے؟ قومی جدوجہد اُس عمل کو کہتے ہیں جو اجتماعی طور پر کسی معاشرے کی ترقی یا کسی قوم کی آزادی اور خوشحالی کیلئے کیا جاتا ہے وہ کسی تنظیم کی شکل یا کسی گروہ پر مشتمل افراد کی شکل میں کیا جائے اسے قومی جدوجہد کہتے ہیں۔

اس قسم کی جدوجہد اُس وقت کیا جاتا ہے جب کسی قوم یا ریاست پر دوسری قوم یا ریاست کا قبضہ یا حاکمیت ہو تو مقبوضہ ریاست کے محکوم باشندوں کے دلوں میں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ ہم پر جبری قبضہ کیوں ہے؟ ہمیں غلام کیوں بنایا گیا ہے؟ بقول روسُو کے کہ "Man has been born free but every where he is in chain" یعنی "انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے" تو اُس وقت مقبوضہ ریاست کے باشندوں کو شعور آتا ہے اور وہ اپنی قوم یا ریاست کی آزادی کیلئے جدوجہد شروع کرتے ہیں اسی طرح آج سے تقریباً 67/68 سال پہلے یعنی 1947 میں بلوچستان ایک آزاد ریاست تھا۔ جو متحدہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد دو الگ ریاست یعنی پاکستان اور بھارت وجود میں آئے۔ تو اُسی دوران پاکستان نے بلوچستان پر جبری قبضہ کر کے اسے اپنی نقشے میں پیش کیا۔ تو ٹھیک اُسی وقت سے بلوچ قوم نے قبضے کو جبری قبضہ قرار دے کر اپنی الگ و آزاد ریاست کی بحالی کیلئے جدوجہد شروع کی جو آج تک جاری ہے اس جدوجہد میں ہزاروں بلوچ فرزندوں نے اپنی جانوں کی قربانیاں دی ہیں اور ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں اب ابھی قابض ریاست کے ٹارچر سیلوں میں اذیتیں سہہ رہے ہیں قابض ریاست نے بلوچوں کو دھوکہ دینے کیلئے کئی مراعات و پیکجز پیش کئے لیکن بلوچستان کے باشعور قوم نے اُن مراعات و پیکجز کو ٹھکرا کر اپنی آزادی کی جدوجہد کو جاری رکھا۔ آج میں ایک ایسے نوجوان کی کہانی سُنانے جارہا ہوں جس نے قومی آزادی کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے کر تاریخ رقم کردی ہے۔ ایک ایسے نوجوان جو ہر وقت ہنستا مسکُراتا نظر آتا تھا۔ جسکی مُسکراہٹ آج بھی ہم سب کے سامنے عیاں ہے، وہ نوجوان شہید رضا جہانگیر (شے مُرید) ہیں۔ شہید رضا جہانگیر بلوچستان کے ایک پسماندہ علاقہ آواران کے گاؤں تیرتیج میں ایک غریب بلوچ واجہ بختیار کے ہاں پیدا ہوئے۔ اپنی ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول سے حاصل کی۔ میٹرک ماڈل ہائی اسکول آواران سے پاس حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کیلئے کوئٹہ کا رُخ کیا۔ کوئٹہ میں سریاب روڈ پر واقع پولی ٹیکنک کالج میں (سب انجینئرنگ) کیلئے داخلہ لیا۔ دوران تعلیم اپنی قومی غلامی کو دیکھ کر ریاست کے خلاف جدوجہد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ شہید رضا جہانگیر نے بی ایس او آزاد (BSO AZAD) کے پلیٹ فارم سے اپنی جدوجہد شروع کی۔ سچا اور ایماندار انسان اپنے لئے جگہ خود بناتا ہے اپنی ایمانداری کی بدولت بی ایس او آزاد کے مختلف عہدوں پر ہوتے ہوئے گذشتہ کونسل سیشن میں سیکریٹری جنرل کا عہدہ پایا۔ شہید دورانِ جدوجہد ایک سیاسی تبلیغی کی مانند تھے۔ جنہوں نے آزادی کا پیغام بلوچستان کے کونے کونے میں پہنچایا۔ جہاں کہیں جاتا تو وہاں کے لوگوں خاص کر نوجوانوں کو یکجا کر کے اُنہیں قومی آزادی کی تحریک کے بارے میں شعور و آگاہی کا درس دیتا تھا۔ اُنہیں گہری نیند سے جگا کر روشن مستقبل کیلئے جدوجہد کرنے پر اُبھارتا تھا۔ شہید کو کتابوں سے زیادہ دلچسپی تھا اور نوجوانوں کو ہر وقت تعلیم حاصل کرنے پر زور دیتا تھا۔ میرے خیال میں بلوچستان میں شاید ہی کوئی ایسی جگہ رہ گئی ہوا۔ جہاں شہید نے آزادی کا پیغام نہیں پہنچایا ہو۔ آج بلوچستان کے کونے کونے میں شہید کی آواز گونج رہی ہے اور وہ ہنستا مُسکراتا چہرہ جہد آزادی کا تلقین کررہا ہے۔ چاہے بولان کی وادیاں ہوں، آواران کی صحرائیں اور پہاڑیاں ہوں، شال کی گلیاں ہوں، چلتن اور زرغون کی چوٹیاں ہوں، پسنی اور گوادر کا ساحلِ سمندر ہو۔ جہاں جہاں پہ جاؤ تو شہید کا فکر اور مُسکان نما چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ شہید 14 اگست (جو بلوچستان میں یوم سیاہ کے طور پر منایا جاتا ہے) 2013 کو تربت کے علاقے آپسر میں اپنے ایک اہم فکر ساتھی امداد بلوچ کے ساتھ اُنکے گھر میں دشمن کی یلغار کے دوران جام شہادت نوش کر گئے اس لیے کہتے ہیں کہ شہید مرتے نہیں ہمیشہ کیلئے امر ہوتے ہیں بالکل اِسی طرح وہ ہنستا مُسکراتا چہرہ جو جسمانی طور پر ہم سے بچھڑ گیا۔ لیکن ان کی فکر اور حوصلہ آج بھی بلوچ قوم کے دل و دماغ میں زندہ ہیں۔

بقول ایک فلاسفر " انسان کی سب سے بڑی نقصان موت نہیں ہوتی بلکہ اُس کی سب سے بڑی نقصان زندہ رہنے پر ضمیر کا مرنا ہے"

شہید ایک باضمیر انسان تھے اور ان کی ضمیر نے انہیں کی طرف راغب کیا۔

بقولِ شہید: "غلام مرگ ءَ شوھاز بکنت
مرگ غلام ءَ شوھاز مکنت"

کلّان آپریشن کا ون مین آرمی!

(شہید ظفر جان، شہید یوسف جان، شہید بانک حلیمہ)

میار بلوچ

آج 4 اکتوبر 2013 کی رات کو میں ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اچانک فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ جب میں نے موبائل کو اٹھایا کہ دوستوں کا حال پوچھوں تو ایک فکر دوست کا میسج آیا (شمے نیمگا خیرانت فائرنگ کجا بیا گانت؟) ''آپ لوگوں کی طرف خیر ہے فائرنگ کہاں ہو رہی ہے'' اس پیغام کو پڑھ کر مجھے شہید ظفر جان یاد آ گئے جب میں نے قلم اٹھا کر لکھنا شروع کیا تو میرے زہن میں شہید ظفر جان کی بیٹی دو سالہ نورین گل کی وہ بات یاد آئی۔۔۔ کہ وہ چلّا کر کہہ رہی تھی۔۔۔ ''بابا، بابا''۔۔۔ میرے آنسو گرنا شروع ہوئے، مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن میرے ضمیر نے مجھے کلّان آپریشن کا واقعہ لکھنے پر مجبور کیا۔

9 اکتوبر 2013 کو دوپہر 2 بج کر 45 منٹ پر میں اپنے گھر میں تھا کہ مجھے بہت سے گاڑیوں کی آواز سنائی دی، میں نے گھر سے باہر نکل کر دیکھا پورا گلی قابض فورسز کے گاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔۔۔۔ دوستوں کے کہنے پر میں ایک فکری دوست کے گھر گیا تا کہ کوئی مسئلہ پیش نہ آئے۔۔۔ اور فائرنگ شروع ہوئی۔۔۔۔ جب ہم نے دیوار سے جھانک کر دیکھا، ہمارے گھر سے ایک کلو میٹر دور مزارزئی محلّہ میں ظفر جان کے گھر پر قابض فورسز نے حملہ کر دیا ہے۔۔۔۔ اور جوابی فائرنگ بھی ہو رہا ہے۔۔۔ کون فائرنگ کر رہا ہے ۔۔۔ اپنے ایک کلاشنکوف کے ساتھ، اکیلا شہید ظفر جان پورے فوج کا مردانہ وار مقابلہ کر رہا ہے۔۔۔ گھروں کے اوپر مورچہ زن ایف سی کے کارندے ایک کے بعد ایک ظفر جان کے وار سے نیچے گر رہے ہیں۔۔۔ پورے 6 گھنٹے مقابلہ کے بعد فائرنگ ختم ہوا تو ہم جلدی جلدی مزارزئی محلّہ پہنچ گئے، دیکھا کہ ایف سی کے غنڈے ابھی تک موجود ہیں اور کسی کو اندر جانے نہیں دے رہے ہیں۔ محلّے کے مرد حضرات جو روزگار کے سلسلے میں گھر سے نکلے تھے اپنے بچوں کے خوف کا بھیک مانگ رہے تھے۔۔۔ لیکن غلام کا آواز آقا کے کانوں تک کب پہنچتا ہے۔۔۔ میں نے دیکھا ایک 80 سال کا بزرگ رو رو کر کہہ رہا تھا کہ'' مجھے جانے دو۔۔۔ میرے گھر میں کوئی نہیں ہے۔۔۔ میرے بچے خوف سے مر جائینگے'' تو ایف سی کیپٹن نے جواب دیا ''مرنے دو کیا فرق پڑتا ہے'' یہ جملہ سنتے ہی بزرگ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔۔۔ بزرگ کے گرنے سے مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔۔۔ میں ہی کیوں۔۔۔؟ بلکہ کوئی بھی باشعور شخص یہ واقعہ دیکھتا تو اس کے رونگھٹے کھڑے ہوتے۔۔۔، ہم نے بزرگ کو اٹھایا، تسلّی دیا، اور صبر کرنے کی تلقین کی۔

اس وقت ریاستی پولیس بھی پہنچ گئی، پولیس کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں ملی۔ ہم نے پولیس سے پوچھا کہ کیوں اندر جانے نہیں دیا جا رہا، اب تو جنگ ختم ہو چکا ہے۔ پولیس نے جواب دیا کہ شواہد مٹائے جا رہے ہیں۔۔۔ کیا شوائد۔۔۔؟ ایف سی کارندوں کے موت کے شوائد۔۔۔ 9 بج کر 10 منٹ کو ایف سی نے محلّہ کو خالی کر دیا تو ہم ظفر جان کے گھر پہنچ گئے، دیکھا کہ ظفر جان، محمد یوسف، اور بانک حلیمہ کے مسکراتے ہوئے لاش پڑے ہوئے ہیں۔ اسی وقت میری نظر ایک معصوم دو سالہ بچی پر پڑی جو شہید ظفر جان کی بیٹی تھی اور چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ اسکی آواز سینے کو چیر کر دل کو اثر کر رہی تھی۔ ہم نے لاشوں کو اٹھایا، اور پولیس بھی آ گئی۔ لاشوں کو پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ گھر میں زندہ بچنے والے عورتوں کو تسلّی دی، برداشت کرنے کی تلقین کی اور واقعہ کا حال پوچھا۔ (محلّے کے دوسرے عورتوں اور بچوں سے بھی واقعہ کا حال پوچھا) تو واقعہ اس طرح پیش آیا۔۔۔

9 اکتوبر 2013 دن 2:45 کو ایف سی اور مسلح دفاع کے کارندے خاران کلّان میں مزارزئی محلّہ کو گھیرے میں لے لیتے ہیں اور شہید ظفر جان کے گھر کے دروازہ کو کھٹکھٹاتے ہیں۔ بانک حلیمہ اندر سے پوچھتی ہے۔۔۔ کون ہو؟ جواب آتا ہے دروازہ کھولو۔۔۔ جب بانک حلیمہ دروازے کے سوراخ سے جھانک کر دیکھتی ہے۔ کچھ نقاب پوش اور ایف سی کے غنڈے کھڑے ہوتے ہیں۔ (یاد رہے اس وقت ظفر جان اور محمد یوسف کونے کے کمرے میں ہوتے ہیں جہاں انکے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہوتا ہے۔ ایک کلاشنکوف اور کچھ ہینڈ گرنیڈ دوسرے کمرے میں ہوتے ہے) بانک حلیمہ آواز دی ہے۔۔۔ ظفر۔۔۔ ظفر۔۔۔ ایف سی آیا ہے، اسی وقت بزدل ایف سی دروازے کو فائر کرتے ہیں اور دیوار کو پھلانگ کر اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی وقت ظفر جان کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے کے لئے دوڑتا ہے جب ایف سی فائر کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو بانک حلیمہ سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ بزدل ایف سی فائر کرتے ہیں جو بانک کے ٹانگ کو لگ

جاتی ہے، بانک اپنا دوپٹہ پھاڑ کر ٹانگ کو باندھ لیتی ہے۔اس طرح ظفر جان دوسرے کمرے میں پہنچ جاتا ہے بندوق اٹھا کر باہر آجاتا ہے اور دشمن پر حملہ آور ہوجاتا ہے پہلے ہی حملے میں 8 ایف سی اہلکار جہنم رسید ہوتے ہیں۔ بوکھلاہٹ کا شکار ایف سی اہلکار اندھا دھند فائرنگ شروع کرتے ہیں جس سے یوسف جان شہید ہوکر ہمیشہ کے لیے امر ہوجاتا ہے دوسری طرف ظفر جان دیدہ دلیری سے ایف سی کا مقابلہ کررہا ہوتا ہے ظفر جان کے وار سے ایک ایک ہوکر ایف سی اہلکار گر رہے ہوتے ہیں۔کہ اسی وقت پیچھے سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے اور ظفر جان شدید زخمی ہوتا ہے ۔ بانک اپنے دوپٹے کے ٹکڑوں سے ظفر جان کے زخموں کو باندھ کر بلیڈنگ کو روکتی ہے۔اس کے بعد ظفر جان دستی بم پھینک دیتا ہے جس سے 3 ایف سی اہلکار جہنم رسید ہوتے ہیں۔ بزدل فورسز گھر پر گولہ باری کرتے ہیں اور راکٹ لانچر فائر کرتے ہیں حتٰی کہ انکے سامان ختم ہوجاتے ہیں۔خاران ایف سی کیمپ سے 4 گاڑی سامان اور تازہ دستہ پہنچ جاتا ہے۔آخر کار ایف سی ظفر جان کے کمرہ کے اوپر پہنچ جاتے ہیں اور مشین گن کا فائر کھول دیتے ہیں جس سے ون مین آرمی ظفر جان ہمیشہ کے لیے امر ہوجاتا ہے۔(ظفر جان کو ون مین آرمی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ظفر جان نے اکیلا پورے فورس کا 6 گھنٹے تک مردانہ وار مقابلہ کیا تھا) اور بانک شدید زخمی ہوجاتی ہے۔

ایف سی اہلکار اور مسلح دفاع کے کارندے ظفر جان کو مارنے کا جشن مناتے ہیں اور ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے ہوتے ہیں کہ زخموں سے چور بانک حلیمہ بندوق اٹھا کر جنگ شروع کردیتی ہے اور اپنے بدن پر گولیاں سجا کر اپنے دوپٹہ کو پھاڑ کر بلیڈنگ کو روکتی ہے اور آزاد بلوچستان کا نعرہ لگا کر جنگ شروع کرتی ہے۔

۔۔قربان بلوچ قوم کے ایسے خواتین پر جو سینے میں 35 سے زائد گولیاں سجا کر ہمیشہ کیلئے امر ہوجاتی ہے اس وقت پورا علاقہ قیامت صغرٰی منظر پیش کررہا تھا کہ ایک بہت بڑے چیخ کے بعد خاموشی طاری ہوتی ہے۔جب علاقے کے لوگ اندر جانے کی کوشش کرتے ہیں تو انھیں روک کر کہا جاتا ہے دس منٹ میں علاقہ خالی کرینگے اور اپنے شوائد مٹانے میں دو گھنٹے لگا دیتے ہیں۔اور 9 بج کر 10 منٹ کو علاقہ خالی کردیتے ہیں۔علاقے کے لوگ اپنے گھروں کی چادر و چار دیواری کی پامالی پر رو رہے تھے۔ایک سفید ریش بزرگ رو رو کر کہہ رہا تھا۔ہمارے گھر کے عورتوں کو کبھی کسی غیر محرم نے نہیں دیکھا۔آج ایف سی اہلکار بغیر اجازت کے گھر کے اندر داخل ہوئے۔ جو کہ غیر اخلاقی فعل ہے۔کیا آج ہمارا عزت اتنا سستا ہوا ہے کہ ایف سی ہمارے گھر میں بغیر اجازت کے داخل ہوں۔۔؟ ہاں اسی طرح ہوتا ہے غلام کا عزت آقا کے سامنے،،،، اگر ہم آج نہیں اٹھے تو ہمارے آنے والی نسلیں ہمیں کیا نام دیں گے؟؟؟

خیر یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد ہم نے واقعہ میں بچنے والے عورتوں سے پوچھا کہ ظفر جان کے موبائل ایف سی لے گئے ہیں کیا؟ انہوں نے کہا جب ظفر جان پوری طرح زخمی ہوچکا تھا تو اس نے اپنا موبائل فون، سم کارڈ، میموری کارڈ، سیٹلائٹ فون اور کچھ کاغذات جلا دیے تھے۔جب ہم نے یہ سنا تو چہرے پر مسکرائٹ اور دل میں جوش تھا کہ بے قابو ہوکر منہ سے یہ نعرہ نکل گیا ''شہید ظفر جان تئ جرات ئسد سلام انت''

ملک اور عوام کیلئے پورے خلوص سے جنگ کرنے کا مقدس جذبہ ہماری عوامی فوج کے سپاہیوں کیلئے بہادری اور ہمت و حوصلہ کا ایک لازوال سرچشمہ ہے۔

﴿﴿﴿ کامریڈ کمال سنگ ﴾﴾﴾

پارٹی اور طبقہ

ٹیڈ گرانٹ

روسی انقلاب نو ماہ کے عرصے پر محیط تھا۔ اس دوران بالشویک پارٹی نے انتہائی جمہوری ذرائع استعمال کرتے ہوئے مزدوروں اور غریب کسانوں کی فیصلہ کن اکثریت کو جیت لیا۔ اسی سے اس امر کی وضاحت ہوسکتی ہے کہ انہوں نے کرنسکی کی مزاحمت پر اتنی آسانی سے کیسے قابو پالیا۔ علاوہ ازیں جیسا کہ ہم دیکھیں گے بالشویکوں کے پاس کوئی ایسا طریقہ نہیں تھا کہ وہ سماج کی واضح اکثریت کی حمایت کے بغیر اقتدار پر قابض رہ سکتے۔ ہر مرحلے پر عوام کی سرگرم مداخلت نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اسکی مہر سارے عمل پر ثبت ہے۔ حکمران طبقہ اور اس کے سیاسی وفوجی نمائندے محض اپنے دانت ہی کچکچا سکتے تھے مگر اقتدار کو اپنے ہاتھوں سے پھسلنے سے نہیں روک سکتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ وہ انقلاب کیخلاف مستقل سازشوں میں ملوث تھے جن میں جنرل کورنیلوف کی وہ فوجی بغاوت بھی شامل ہے جو کرنسکی کا تختہ الٹ کر ایک فوجی آمریت قائم کرنے کیلئے کی گئی تھی۔ مگر عوام کی تحریک کے آگے یہ سب کچھ دھرا رہ گیا۔

بالشویکوں کیلئے عوامی حمایت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف اس وقت ہر کسی نے کیا جن میں انقلاب کے بدترین دشمن بھی شامل ہیں۔ فطری امر ہے کہ وہ اس کا ذمہ دار ہر طرح کے غلط عوامل ''جذباتی خطابت''، کسانوں اور مزدوروں کے ناپختہ پن، ان کی مبینہ جہالت کو قرار دیتے ہیں اور اس کے علاوہ تمام دوسرے دلائل جو بذات خود جمہوریت کے خلاف استعمال ہوتے ہیں۔ یہ بات یقیناً عظیم ترین اسراروں میں سے ایک ہے کہ عوام صرف اس وقت ناپختہ اور جاہل کیسے بن گئے جب انہوں نے عارضی حکومت کی حمایت ترک کی۔ لیکن اگر ہم کمینگی، کینہ پروری اور لاچارگی کے غصے سے صرف نظر کر لیں تو ہمیں دائیں بازو کے ایک اخبار میں یہ قابل قدر اعتراف دکھائی دے گا کہ بالشویکوں کو واقعی عوام کی حمایت حاصل تھی۔ 28 اکتوبر کو رسکایا ووليا نے مندرجہ ذیل سطریں تحریر کیں، ''بالشویکوں کی کامیابی کے امکانات کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کیونکہ ان کی سب سے بڑی حامی عوام کی جہالت ہے۔ وہ اسی پر داؤ لگاتے ہیں اور اس پر اپنی جذباتی خطابت کا ایسا زور لگاتے ہیں کہ اس کا مقابلہ کوئی شے نہیں کرسکتی۔''(18)

1917ء میں جو کچھ ہوا اسے عوام کے مرکزی کردار کو دیکھے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔ 94-1789ء کے فرانسیسی انقلاب کے بارے میں بھی یہ بات درست ہے جسے تاریخ دان اکثر سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ (اس میں استثنیات موجود ہیں جن میں کروپوٹکن نامی انارکسٹ اور ہمارے اپنے عہد کا جارج روڈ قابل ذکر ہیں) لیکن یہاں ہم تاریخ میں پہلی بار مزدور طبقے کو واقعتاً اقتدار پر کامیابی سے قابض ہوتے اور کم از کم سماج کی سوشلسٹ تبدیلی کی شروعات کرتے دیکھتے ہیں، اگر ہم پیرس کمیون کے مختصر مگر شاندار دور کو شمار نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ سوشلزم کے دشمن اکتوبر انقلاب کے بارے میں دروغ گوئی اور بہتان تراشی پر مجبور ہیں۔ وہ لینن اور بالشویکوں کو اس وجہ سے کبھی معاف نہیں کرسکتے کہ انہوں نے کامیابی سے پہلے کامیاب سوشلسٹ انقلاب کی راہنمائی کی اور یہ ثابت کیا کہ ایسی بات ممکن ہے اور اس طرح مستقبل کی نسلوں کو ایک راستہ سمجھایا۔ اس قسم کی مثال خطرناک ہے! لہٰذا یہ ''ثابت'' کرنا ضروری ہے (معمول کے مطابق ''غیر جانبدار'' عالموں کی اعانت سے) کہ یہ سب کچھ بہت غلط تھا جسے قطعاً دہرایا نہیں جانا چاہیے۔

اکتوبر انقلاب کو بغاوت ثابت کرنے کیلئے اکثر اوقات جواز کے طور پر

اس معمولی تعداد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو بذات خود بغاوت میں براہ راست ملوث تھی۔ بظاہر گہری دکھائی دینے والی یہ دلیل معمولی سے جائزے کی مزاحمت بھی نہیں کرسکتی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ مسلح بغاوت کو انقلاب کے ساتھ گڈمڈ کرتی ہے یعنی یہ جز کو کل خیال کرنے کی غلطی کرتی ہے۔ حقیقت میں بغاوت انقلاب کا محض ایک جزو ہوتی ہے، یہ سچ ہے کہ بہت اہم جزو ہوتی ہے۔ ٹراٹسکی اسے لہر کے اوپری جھاگ دار حصے سے تشبیہہ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیٹروگراڈ میں ہوانیوالی لڑائی بہت معمولی تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انقلاب میں خونریزی نہیں ہوئی اسکی وجہ یہ تھی کہ مزدوروں اور سپاہیوں کی فیصلہ کن اکثریت کو جیت کردس میں سے نو حصے کام پہلے ہی مکمل کیا جاچکا تھا۔ تب بھی پرانے نظام کی مزاحمت پر قابو پانے کیلئے مسلح طاقت کا استعمال ضروری تھا۔ کسی بھی حکمران طبقے نے کبھی بھی لڑے بغیر ہتھیار نہیں ڈالے۔ مگر مزاحمت برائے نام تھی۔ حکومت ریت کے گھروندے کی طرح ڈھے گئی کیونکہ کوئی بھی اس کا دفاع کرنے کو تیار نہیں تھا۔

ماسکو میں زیادہ تر مقامی بالشویکوں کی غلطیوں کی وجہ سے، جنہوں نے زیادہ توانائی کا مظاہرہ نہیں کیا، رد انقلابی فوجی افسران نے ابتدائی طور پر جارحانہ رویہ اپنا کر قتل عام کیا۔ اس کے باوجود یہ امر ناقابل یقین ہے کہ انہیں اس یقین دہانی کے بعد چھوڑ دیا گیا کہ وہ وعدہ کریں کہ آئندہ سوویت اقتدار کیخلاف تشدد آمیز حرکات نہیں کریں گے۔ انقلاب کے ابتدائی دنوں میں اس قسم کی باتیں عام تھیں جن سے عوام کی اس سادہ لوحی کا اظہار ہوتا ہے کہ ابھی انہیں اندازہ نہیں تھا کہ پرانے نظام کا دفاع کرنے والے کس قدر خوفناک تشدد پر اتر سکتے تھے۔ خونخوار اور دہشت ناک ہونے کے برخلاف انقلاب غیر معمولی طور پر مہربان تھا، جب تک رد انقلاب نے اپنی حقیقی فطرت ظاہر نہیں کی۔ بالشویکوں کیخلاف پہلی بغاوت کرنے والا سفید جنرل پی کراسنوفتھا جو قزاقوں کی سربراہی کر رہا تھا، سرخ محافظوں نے اسے شکست دے دی اور قزاقوں نے اسے خود پکڑ کر انکے حوالے کر دیا مگر ایک بار پھر اسے مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ اس بارے میں وکٹر سرجی بجا طور پر کہتا ہے، ''انقلاب نے قزاقوں کے حملے کے لیڈر کے سلسلے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کر کے غلطی کی۔ اسے موقع پر ہی گولی مار دینا چاہیے تھی۔ اپنی غیرت کی قسم کھا کر یہ عہد کرنے کے بعد کہ وہ انقلاب کے خلاف آئندہ ہتھیار نہیں اٹھائے گا اسے چند روز بعد رہا کر دیا گیا۔ لیکن ملک اور نجی ملکیت کے دشمنوں کے سامنے کئے گئے وعدوں کی کیا حیثیت ہے؟ بعد ازاں وہ ڈان کے علاقے میں پہنچ گیا اور وہاں آگ اور خون کی ہولی کھیلی۔''(19)

کیا جنگ میں حصہ لینے والوں کی نسبتاً کم تعداد کا مطلب یہ ہے کہ اکتوبر انقلاب ایک کوُ (COUP) تھا؟ طبقاتی جنگ اور قوموں کے درمیان جنگ میں بہت سی مماثلات ہیں۔ موخرالذکر صورت میں بھی آبادی کا ایک چھوٹا سا حصہ مسلح افواج میں ہوتا ہے اور فوج کی ایک چھوٹی سی تعداد محاذ جنگ پر ہوتی ہے۔ ایک بڑی لڑائی کی صورت میں بھی ان کی ایک چھوٹی سی تعداد ہی عام طور پر کسی ایک وقت میں براہ راست لڑائی میں ملوث ہوتی ہے۔ تجربہ کار فوجی جانتے ہیں کہ دوران جنگ بہت سا وقت بیکار بیٹھ کر صرف کیا جاتا ہے۔ اکثر اوقات بیرکوں میں محفوظ فوجیوں کو سرگرم عمل کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ علاوہ ازیں گھروں میں موجود آبادی کی دلی حمایت کے بغیر کامیابی سے جنگ لڑنا ممکن ہی نہیں ہوگا اگرچہ وہ براہ راست جنگ میں حصہ نہیں لیتی۔ ویت نام کی جنگ کے آخری مراحل میں یہ سبق پینٹاگون کی ناک پر کھودا گیا تھا۔

اس دلیل کو کہ بالشویک عوام کی حمایت کے بغیر اقتدار پر قبضے کے قابل ہوگئے تھے عموماً اس تصور کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے کہ اقتدار پر قبضہ مزدور طبقے نے نہیں بلکہ ایک پارٹی نے کیا تھا۔ یہ دلیل بھی بالکل غلط ہے۔ تنظیم، ٹریڈ یونین اور پارٹی کے بغیر مزدور طبقہ محض استحصال کیلئے خام مال ہوتا ہے۔ مارکس اس بارے میں بہت عرصہ پہلے ہی کہہ چکا ہے۔ یہ درست ہے کہ پرولتاریہ

بے پناہ قوت رکھتا ہے۔اس کی اجازت کے بغیر کوئی پہیہ نہیں چل سکتا اور نہ ہی کوئی بلب روشن ہوسکتا ہے۔مگر تنظیم کے بغیر یہ قوت محض ایک امکان ہی رہتی ہے۔اسی طرح بھاپ میں بہت قوت ہوتی ہے مگر انجن کے بغیر یہ بے ضرر انداز میں ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔مزدور طبقے کی قوت کو محض ایک امکان سے حقیقت میں تبدیل کرنے کیلئے اس کو منظّم کر کے ایک واحد نقطے پر مرکوز کرنا ضروری ہے۔یہ صرف ایک ایسی سیاسی پارٹی کے ذریعے کیا جاسکتا ہے جس کی لیڈرشپ جرأت منداور دوراندیش ہواور اس کا پروگرام درست ہو۔لینن اور ٹراٹسکی کی لیڈرشپ کے تحت بالشویک پارٹی ایک ایسی ہی پارٹی تھی۔عوام کی تحریک (ایک ایسی شاندار تحریک جو روسی سماج کے تمام تر زندہ اور متحرک حصوں کی نمائندگی کرتی تھی) پر انحصار کرتے ہوئے انہوں نے اسے ہیئت، مقصد اور آواز مہیا کی۔حکمران طبقے اور مزدور تحریک میں اس کے ہم خیال لوگوں کے نقطہ نظر کے مطابق یہی اس کا سب سے بڑا گناہ ہے۔بالشوازم سے نفرت و کراہت، تندوترش تنقید اور کینہ پروری پر مبنی رویے کی تہہ میں یہی راز نہاں ہے جو تین نسلوں کے بعد آج بھی ان کے رویے پر مکمل طور پر حاوی ہے۔

اپنی ہمت و جوانمردی کے باوجود مزدور 1917ء میں بالشویک پارٹی، لینن اور ٹراٹسکی کی لیڈرشپ کے بغیر کبھی اقتدار حاصل نہ کر سکتے۔انقلابی پارٹی عین وقت پر تیار نہیں کی جاسکتی بالکل اسی طرح جیسے جنرل سٹاف کی تشکیل جنگ چھڑنے پر نہیں کی جاسکتی۔اسے سالوں اور عشروں پر محیط عرصے میں منظّم انداز میں ترتیب دینا پڑتا ہے۔اس کا ثبوت تمام تاریخ، بالخصوص بیسویں صدی کی تاریخ میں ملتا ہے۔عظیم انقلابی اور مزدور طبقے کی شہید روزالکسمبرگ اس بات پر ہمیشہ زور دیتی تھی کہ عوام کی انقلابی پہل گامی انقلاب کی بنیادی قوت ہے۔اس بارے میں وہ بالکل درست تھی۔انقلاب کے دوران عوام بہت تیزی سے سیکھتے ہیں مگر انقلابی صورت حال کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی۔نہ تو سماج ہی مستقل ہیجان کی کیفیت میں رہ سکتا ہے اور نہ ہی مزدور طبقہ شدید سرگرمی کی کیفیت میں۔اسی مدت میں یا تو کوئی راستہ کھلتا ہے یا پھر یہ لمحہ ضائع ہو جاتا ہے۔نہ تو تجربات کیلئے کافی وقت ہوتا ہے اور نہ ہی مزدوروں کیلئے اپنی غلطیوں سے سیکھنے کیلئے زیادہ وقت ہوتا ہے۔زندگی اور موت کی صورتحال میں غلطیوں کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔لہٰذا ضروری ہے کہ عوام کی ''برجستہ'' تحریک کو تنظیم، پروگرام، پیش منظر، حکمت عملی اور طریقہ کار سے منسلک کیا جائے یعنی ایک انقلابی پارٹی کے ساتھ، جس کی رہنمائی تجربہ کار کیڈرز کے ہاتھ میں ہو۔اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ ہر مرحلے پر بالشویکوں کے سامنے عالمی انقلاب کا پیش منظر موجود رہا ہے۔انہیں اس بات پر قطعاً یقین نہیں تھا کہ وہ صرف روس کے اندر اقتدار پر قابض رہ سکتے ہیں۔یہ اکتوبر انقلاب کی قوت کا زبردست ثبوت ہے کہ تمام تر نشیب وفراز، سٹالنزم کے تمام تر جرائم اور دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے باوجود بنیادی فتوحات اتنے طویل عرصے تک قائم رہیں۔اس وقت بھی جب باقی دنیا کی مدد سے محروم ہونے کے بعد اسے محض اپنے وسائل پر تکیہ کرنا پڑا۔یہاں تک کہ آخری دور میں بھی سٹالنزم کی ٹوٹ پھوٹ قومیائی گئی منصوبہ بند معیشت کی کسی جبلی خرابی کے باعث نہیں ہوئی بلکہ اس کا باعث نوکر شاہی کا دھوکہ اور غداری تھی جس کے بارے میں ٹراٹسکی نے نہایت شاندار انداز میں پیش گوئی کی تھی اور جو اپنی مراعات قائم رکھنے کی کوشش میں سرمایہ داری کے ہاتھوں بک گئی۔

آئینہ حقائق

چیدہ چیدہ حالات ، واقعات اور خبروں پر آزاد کا ماہانہ تجزیہ

ادارہ

ریا ستی بلدیاتی انتخا با ت اور بلوچ

ہر دن ہر مہینہ محکوم قوم کے لئے ایک جیسا ہوتا ہے۔ روز لاشوں کا ملنا کسی گھر کے چراغ کا بوجھ جانا اب روز کا معمول بن چکا ہے، باقی مہینوں کی طرح دسمبر میں بھی اُس طرح لاشوں کا ملنا اغواء ہونا یا ریاستی ڈیتھ اسکواڑ کی ٹارگٹ سے قتل کر ناجاری رہا اور جس میں عالمی سامراجیت کے زیر سایہ تسلّط وتشدد کا داغ بیل پڑنے کے بعد طویل عرصے سے استحصالیت اور خونیں کھیل کا میدان بننے والے لہولہاں مادر وطن بلوچستان اور اس کے مظلوم باسی قابض پاکستان اور اس کے آلہ کار جابر قوتوں کے رحم وکرم پر شدید غیر انسانی رویوں اور نت نئی سازشوں کا شکار رہیں ۔انسانیت سوز مظالم ،نسل کش فوجی کاروائیاں ،جبری اغواء کاریاں اور ماورائے عدالت وقانون بے دریغ قتل عام سامراجیت وقبضہ گیریت کو برقرار رکھنے کے موثر ترین ذرائع قرار پائے ہیں ۔جن کی توسط سے ہمہ وقت آئین، قانون پارلیمنٹ ،جمہوریت ،انتخابات اور ریاست ومملکت جیسے خود ساختہ رنگین انڈوں کے بندوبست پر مبنی سامراجی سوچ کو پروان چڑھانا مقصود رہا ہے۔اسی لئے جمہوریت کے تقاضے کا جواز تراش کر قبضہ گیر ادارہ الیکشن کمیشن آف پاکستان کی جانب 7 دسمبر کو مقبوضہ بلوچستان میں جبراً لوکل باڈیز الیکشن منعقد کرانے کا اعلان کیا گیا۔جس کے بعد مذہبی وغیر مذہبی خیمہ بردار پارلیمانی گروہوں کو ہاتھ پیر مار کر ایک بار پھر جمہوریت ،انتخابات اور پارلیمنٹ کا ڈھنڈورا پیٹنے کی گرین سگنل جاری کی گئی ۔جس کے لئے انہیں ہر طرح سے معاشی وعسکری کمک سے لیس کرنے کی یقین دہانیاں کرائی گئیں ۔جس پر لبیک کہتے ہوئے اقتدار ،اختیار ،دولت ومراعات کے نشے میں بوجھل ڈاکٹر مالک ،حاصل بزنجو ،خیر جان ،رحمت ،اسلم بزنجو ،ثناء اللہ زہری ،سرفراز بگٹی و دیگر کی خصوصی فرمائش پر بلدیاتی انتخابات کی راہ جبراً ہموار کرنے کی سعی لا حاصل میں ڈیرہ بگٹی ،نصیرہ آباد ،سبی ،نیوکاہان ،کیچ پنجگور ،بسیمہ ،خاران ،آواران مشکے، خضدار ،قلات ،سوراب ،مستونگ میں بلوچ نسل کش فوجی کاروائیوں بے تنگ چھاپوں ،ہدف بنا کر قتل کرنے ،اغواء نما گرفتاریوں اور مسخ شدہ لاشیں پھینکنے کے جاری عمل میں شدت لائی گئی۔لیکن 11 مئی کے عام انتخابات کی طرح بلدیاتی الیکشن میں بھی بلوچ آزادی پسند قوتوں کی استرداد کے واضح اعلان پر رائے عامہ اور بلوچ عوام انتخابی عمل سے مکمل لاتعلق رہے۔ بلکہ یُوں کہہ لیجئے کہ انتخابی عمل سرے سے غائب رہا۔قابلِ ذکر آزادی پسند تنظیموں اور سیاسی پارٹیوں انقلابی طلباء تنظیم بلوچ اسٹوڈنس آرگنائزیشن آزاد، بلوچ نیشنل موومنٹ اور بلوچ ریپبلکن پارٹی کی جانب سے پمفلٹنگ 7,6 دسمبر کو دو روز شٹر ڈاؤن و پہیہ جام ہڑتال کے علاوہ عوامی سطح پر الیکشن بائیکاٹ سیاسی آگاہی مہم چلایا گیا۔جبکہ بلوچ لبریشن فرنٹ ،بلوچ لبر یشن آرمی، بلوچ ریپبلکن آرمی اور یونائیٹڈ بلوچ آرمی کی جانب سے بھی عملی سرگرمیاں سامنے آئیں۔جو دشمن قوتوں کے لئے یقیناً ناقابلِ برداشت تھے۔اسی لئے انہوں نے بلدیاتی انتخابات سے قبل ہی ہزاروں آرمی اہلکاروں کو بلوچستان کے طول وعرض میں تعینات کرکے جاری فوجی کاروائیوں میں شدت لاکر مکران ،نصیرآباد ،ڈربی ،RD-238 نیوکاہان اور ڈیرہ بگٹی میں درجنوں بلوچ فرزندوں کو اغواء اور شہید کیا۔الیکشن کی ناکامی کا اندازہ اس امر سے بہتر لگایا جاسکتا ہے کہ مقبوضہ بلوچستان کے اکثر وبیشتر علاقوں سے انتخابی اُمیدوار ہی نہیں تھے۔اور جن چند لوگوں کو بہلا پھسلا کر سازباز کے تحت سامنے لایا گیا۔وہ عملی طور پر ایک ایک کر کے مستعفی ہورہے ہیں۔جبکہ باقی ڈیتھ اسکواڈ ،سرکاری سردار ٹولہ یا غیر مقامی آبادکار لوگ سیٹ ٹو سیٹ ایڈجسٹمنٹ کے نوآبادیاتی اصولوں کے تحت بلا مقابلہ اور بغیر کسی مینڈیٹ کے کامیاب قرار دیئے گئے ،جو پاکستان کی ناکامی کا واضح مظہر ہے ۔

عالمی انسانی حقوق کا دن مناسبت سے منایا گیا

ایک اہم پیشرفت جو انسانی حقوق کی کوششوں کے حوالے سامنے آیا۔10 دسمبر انسانی حقوق کی عالمی دن کے موقع پر وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز اور بلوچ ہیومن رائٹس آرگنائزیشن کی جانب سے کراچی اور شال میں بالترتیب کامیاب سمینارز

منعقد کئے گئے۔ان سیمینارز کا بلوچ قوم، اہل صحافت ودانشوروں سمیت دنیا بھر میں گہرا اثر ہوا۔کراچی سیمنار میں ماما قدیر بلوچ، بانک فرازانہ مجید اور لاپتہ افراد کے لواحقین کے علاوہ بلوچ دانشوار میر محمد علی ٹالپر، سینئر جرنلسٹ محمد حنیف، بلوچ قومی پارٹی کے میر سرمد بلوچ سمیت مختلف طبقہ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد نے حصّہ لیا ۔مقررین نے عالمی دن کی خاموشی کو بلا جواز اور مجرمانہ قرار دیتے ہوئے پاکستان کو اسرائیل سے بھی بدتر ظالم جابر اور سفاک ریاست کہا۔اور بلوچ قوم پر روا رکھے جانے والے بدترین مظالم اور جنگی جرائم پر دنیا سے فوری مداخلت کا مطالبہ کیا گیا ۔جس کے بعد وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کی جانب لاپتہ افراد کی بازیابی کیلئے لانگ مارچ کے دوسرے مرحلے میں 13 دسمبر کو کراچی سے اسلام آباد پیدل لانگ مارچ کا اعلان کیا گیا، جو مجموعی طور پر 1600 کلومیٹر کے طویل فاصلے پر محیط ہے۔کراچی ملیر گڈاپ لیاری اور سندھ بھر سے بلوچ شامل ہوئے اور لانگ مارچ میں میر محمد علی ٹالپور اور میر سرمد بلوچ بھی شریک ہے۔کراچی ملیر گڈاپ لیاری اور سندھ بھر سے بلوچ اور سندھی عوام لانگ مارچ کا تاریخی ساتھ دیا ہے۔اور اندرون سندھ جگہ جگہ لانگ مارچ کے قافلے کا شاندار اور پرتپاک استقبال کیا جارہا ہے۔شرکاء پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جارہی ہیں، جبکہ اخلاقی وسیاسی حمایت کا یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔جو یقیناً تاریخی واقعات ہیں اور اس سے پہلے بلوچ اور سندھیوں کے مابین اتنی والہانہ لگاؤ اور وسیع پیمانے پر باہمی ہمدردی ودوستی کبھی نہیں دیکھی گئے۔شاہد یہ ایک جیسی مظلومیت احساس غلامی اور نظریاتی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے۔جنہیں ایک دوسرے کے ساتھ قربت بڑھانے، دوستی رکھنے اور دکھ سکھ میں شریک کرنے کا موجب بن رہا ہے۔

بلوچ تحریک پر دنیا کی نظر

بلوچ قومی تحریکِ آزادی کا عالمی سطح پر بھی کافی اثر ہوا ہے۔اور انسانیت کے خلاف جرائم کا مرتکب پاکستان کا حقیقی چہرہ طشت از بام ہونے اور قومی سیاسی آواز کے دباؤ پر امریکہ ودیگر عالمی ممالک پاکستان کو عسکری ومعاشی امداد دینے کے حوالے اپنی خارجہ پالیسیوں پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہوگے ہیں۔ٹوکیو میں اقوام متحدہ کے زیلی ادارہ جاپان ایسوسی ایشن برائے مہاجرین نے بی آر پی کے وفد سے ملاقات کے دوران یقین دلایا کہ وہ بلوچ مسئلے کو اپنے فورم میں لازمی اُٹھائیں گے۔امریکہ اگر چہ عالمی سامرجیت کا سرغنہ تصّور کیا جاتا ہے۔مگر بلوچ قوم کی جانب عالمی وعلاقائی سطح پر اُٹھائی گئی مئوثر سیاسی آواز کے نتیجے میں ان کی نمائندگان نے یہ شرط رکھی کہ پاکستان ضمانت دے کہ یہ پیسے بلوچ، سندھی اور دیگر مظلوم طبقات کو دبانے کیلئے استعمال نہیں ہوں گے۔امداد کی بندش کیلئے امریکی ڈیفنس اتھرآئزیشن ایکٹ 2014 کی بھی منظوری دے دی گئی جسے بی ایس او آزاد سمیت آزادی پسند حلقوں نے اہم پیش رفت قرار دیا ہے۔اس کے علاوہ کینیڈین جرنلسٹ شان فاربس، دنیا بھر کے اہل صحافت وقلم اور انسان دوست حلقوں میں بلوچ قومی ایشو پر بہت کچھ لکھا جارہا ہے، اگر چہ پاکستان نے حسبِ سابق اس بار کی تاریخ میں کوئی لمبی عمر نہیں ہے ،اور مضبوط اداروں کے حامل مظلوموں کی جدوجہد اور سروں کی قربانیاں سامراجیت کو نیست ونابود کردیں گی۔ان حالات میں جہاں اپنی سرزمین پر بلوچ قوم کی جان ومال اور عزت وآبرو محفوظ نہیں۔کھٹ پتلی وزیراعلیٰ ڈاکٹر مالک کو آئے روز برآمد ہونے والی مسخ شدہ لاشوں اور بلوچ ماں بہنوں کی غیرت کی دفاع سے کوئی سروکار نہیں رہا انہیں صرف استحصالیت اور قوم دشمنی کے بدلے اپنی پُرتعیش اور لگژری زندگی کا پڑا ہوا ہے، جیسے ان کی پارٹی کے بقیہ لیڈران حاصل بیزنجو، رحمت، خیر جان اظہار خیال کرکے بدنیتی، دشمنی اور بوکھلاہٹ میں آزاد پسند رہنماؤں کو چند آوارہ لوگ گردان کر نظریہ آزادی کی بلوچ سماج میں وجود تک سے انکار کرکے انقلابی حالات کو ذہنی خرابی جیسے بیہودہ لفظ سے چھپانے میں اپنے آقاؤں کا اعتماد بڑھانے اور دل جیتنے کی جتن میں مصروف کار ہیں۔ساتھ ہی وزیراعظم یوتھ بزنس لون پروگرام کا چرچا بھی ان دنوں کثرت سے گوش گزار ہے۔جو خود پاکستان کے لئے بھی ایک سوال بن چکا ہے، جس سے متعلق ریاستی مختلف حلقے اپنے خدشات اور تحفظات کا اظہار کرچکے ہیں۔اور اسے ناکام وبے سود منصوبہ قرار دیا ہے۔اس ضمن میں بلوچ نوجوانوں سے فائدہ اُٹھانے کی دھوکہ دہی پر مبنی اپیل پی پی کے پیکیج کی طرح از خود ناکامی کا شکار ہے۔جو سرمایہ دارانہ نظام کے آئینہ دار ریاست اور اسٹیبلشمنٹ کے متعین منظورِنظر چیدہ چیدہ لوگوں کو فائدہ پہنچانے کا سیاسی شعبدہ بازی پر مبنی حربہ ہے ۔واضح رہے یہ سودی قرضوں پر مبنی بینکنگ پروگرام سرمایہ دارانہ نظام کا شاخسانہ ہے ،جس میں بہت سارے لوگوں کو لون یعنی قرضہ سود پر دینے کی آڑ میں ضمانت ضبط کرانے کی سازش کے تحت ان کی جائیداد، ملکیت، اراضیات ہتھیانے کا ایک مذموم منصوبہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔دوسری طرف زلزلہ متاثرہ علاقوں میں آرمی کا قبضہ بدستور برقرار ہے، جہاں متاثرین پر نت نئی سازشوں کا سلسلہ جاری ہے۔اور آرمی اپنی مذہبی دہشت گردوں جماعت الدّعوۃ کے ذیلی شاخ ایف آئی ایف کے ذریعے لوگوں میں فرقہ واریت، مذہبی عدم رواداری اور تعصب کی فضا قائم کرکے عوام کے زہنوں کو آلودہ کرکے انہیں پاکستانیت کی طرف راغب کرنے میں تیزی لاچکے ہیں ،اسی مقصد کے لئے الخدمت اور الخیر بھی سرگرم عمل ہیں۔علاوہ ازیں استعماری آرمی

نے سادہ لوح علاقہ مکینوں کو کیمپ بُلا کر ان کے بچوں کو ملٹری اکیڈمیوں میں مفت تعلیم دینے کی پیشکش سمیت بے روزگار نوجوانوں کو فوجی اداروں میں لے جا کر مکینیکل اور ٹیکنیکل ٹریننگ دینے کی آڑ میں انہیں پاکستان پرستی کا درس دے کر بلوچ قوم وقومی تحریک آزادی کے خلاف نئے محاذ کھولنے کی ٹھانی ہے ۔مذکورہ ریاستی پیشکش کا ادراک کر کے بلوچ عوام نے اسے عملاً مسترد کر دیا ہے۔

آئی ایس آئی نے بلوچ پناہ گزیں پر حملہ کرایا

گذشتہ مہینے افغانستان کے علاقے اسپین بولدک میں بگٹی پناہ گزین کیمپ پر آئی ایس آئی کے آلہ کاروں نے بم حملہ کر کے دو نوجوانوں کو شہید متعدد کو زخمی کر دیا۔اس واقع نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ بلوچ کہیں بھی محفوظ نہیں ۔چاہے وہ زلزلہ متاثرین ہوں ،یا فوجی کاروئیوں کی اندوہناک اثرات سے تنگ آ کر ہجرت کر کے سندھ ،پنجاب اور افغانستان منتقل ہونے والے بلوچ ،پاکستان انہیں اپنا دشمن تصّور کر کے ان کا قلع قمع کرنے میں کسی لیت ولعل سے کام نہیں لیتا،تو کیوں نہ ہر بلوچ فرزند ،چاہے وہ کہیں بھی رہتا ہو،تحریکِ آزادی

کا حصّہ بن کر دشمن کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے اپنا قومی فریضہ نبھائے ۔

بنگلہ دیش نے ایک اور غدار کو پھانسی کی سزا دی

جس طرح بنگالیوں نے اتحاد واتفاق کا مظاہرہ کر کے اپنی پوری قومی طاقت دشمن پاکستان کے خلاف استعمال میں لا کر آج سے تینتالیس سال قبل آزادی حاصل کر لی تھی اور وہ ہر سال 16 دسمبر کو یومِ آزادی بنگلا دیش کے طور پر مناتے ہیں ۔اس مرتبہ بھی بنگلا دیش میں یومِ آزادی انتہائی جوش وجذبے سے منایا گیا۔ بلکہ اس بار ایک اور اہم واقعہ کا بنگلا دیش کی تاریخ میں اضافہ ہوا جو مظلوموں کے لئے انتہائی حوصلہ افراء ہے۔ جب 13 دسمبر کو یعنی بنگلا دیش کی یومِ آزادی سے صرف 3 دن قبل وار کرائمز ٹریبونل اور سپریم کورٹ کی جانب سے 1971ء میں بنگالی قوم کی نسل کشی ،ہزاروں خواتین کی عصمت دری اور تحریکِ آزادی کو کاؤنٹر کرنے میں پاکستان آرمی کا دست و بازو بننے کی پاداش میں البدر دہشتگرد تنظیم کے سابقہ کارندہ اور جماعت اسلامی کے مرکزی رہنما عبدالقادر مُلا عرف قصائی کو سنائی جانے والی پھانسی کی سزا پر شیخ مجیب الرحمٰن کی بیٹی وزیراعظم شیخ حسینہ واجد کی عوامی لیگ کی حکومت نے عمل درآمد کرائی ۔ جو انتہائی اہمیت کا حامل واقعہ ہے کیونکہ قصائی صاحب بوڑھوں ،بچوں اور عورتوں سمیت 300 افراد کے قتل اور زنا بالجبر کا مرتکب پایا گیا تھا۔مگر چور مچائے شور کے مصداق جماعت اسلامی نے بنگلا دیش میں مُلک گیر پُرتشدد احتجاج کا ایک سلسلہ شروع کیا،جس کا دائرہ اثر پاکستان تک بڑھایا گیا۔جبکہ پاکستانی ربڑ اسٹیمپ پارلیمنٹ نے مشترکہ طور پر اس واقع کے خلاف مذہبی قرارداد پاس کر کے بے شرمی کی تو حد کر دی ۔واضح رہے پاکستان 30 سے 35 لاکھ بنگالیوں کی قتل عام کا مرتکب ٹھہرنے کے باوجود معافی مانگنے کے بجائے آج بنگالیوں کی زخموں کو تازہ کر رہا ہے ۔عمران خان ،منور حسن اور چوہدری نثار نے تو قصائی صاحب کو براہ راست شہید کا لقب دے کر بنگالی سرکار کو 71ء کے مقدمات ختم کرنے کی دھمکی دی ۔یہی ہے چوری الٹا سینہ زوری !اس پر ڈھاکہ میں پاکستان کے خلاف شدید احتجاج ہوا، پاکستان کا جھنڈا نذر آتش کیا گیا اور پاکستانی ہائی کمیشن کو گھیرے میں لیا گیا۔ بنگلا دیش سرکار نے سفارتی سطح پر پاکستان کی اس غیر ذمہ داری اور سرکشی پر احتجاج ریکارڈ کرایا اور وزیراعظم شیخ حسینہ واجد نے دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا کہ ''پاکستان کا ساتھ دینے والوں کے لئے بنگلا دیش میں کوئی جگہ نہیں''۔

ایران کے فوج پر حملہ

حال ہی میں سراوان کے علاقے سیرکن میں قابض ایرانی فورس پاسداران انقلاب کے کانوائے پر اے بی اے (ABA) نامی مسلح تنظیم نے حملہ کر کے متعدد اہلکاروں کو ہلاک کرنے کی ذمہ داری قبول کیا۔جس کے بعد 16 عام بلوچوں کو سرعام تختہ دار پر لٹکایا گیا، پاکستان اور ایران بلوچ قوم کے مشترکہ دشمن اور وسائل وسرزمین پر کئی دہائیوں سے قبضہ جمائے بیٹھے ہیں،ان کے خلاف منظّم جدوجہد سے ہی بلوچ قومی بقاء اور وطن کی آزادی کا راز مضمر ہے،ایران بھی بلوچ نسل کشی میں پاکستان سے کبھی پیچھے نہیں رہا ہے۔سرعام اجتماعی پھانسیوں کی شکل میں بلوچ قوم کے لاتعداد نوجوانوں کو سامراجیت کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

جب دشمن کے خلاف اس طرح کے واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں تو اُمید کے دروازے کُھل کر بابا خیربخش مری کی ایک بات یاد آجاتی ہے

کہ ''ہم نہیں کہتے کہ ہماری سیاسی قومی جدوجہد اس حد تک مضبوط ہے کہ ہم فوری آزادی حاصل کرنے کی پوزیشن رکھتے ہیں ،لیکن چنگاری ہے ،جدوجہد جاری ہے''۔لیکن اب ہمیں بلوچستان میں آنے والے دنوں میں یہ نظر آرہا ہے کہ نام نہاد گماشتہ ڈاکٹر مالک اور اُس کے حکومت پوری طرح بلوچستان میں بلوچ کشی کی پالیسو ں میں مزید تیزی لائے گی اور اپنی وفاداری ثابت کرنے کیلئے پچھلے حکومتوں سے دو قدم آگے جا چکی ہے اور خاص کر ڈیرہ بگٹی ،کوہلو اور مکران میں بھرپور فوجی طاقت استعمال میں لاتی ہے۔

غلام قوموں کی خوشحال مستقبل قبضہ گیر کے ایوانوں میں نہیں بلکہ آزادی میں پوشیدہ ہوتی ہے

بلوچ قوم کے غیرت مند فرزندوں!

پمفلٹ

اس 7 دسمبر کو قبضہ گیر ریاست پاکستان ایک بار پھر اپنے نوآبادیاتی عزائم کی تکمیل کیلئے مقبوضہ بلوچستان میں ایک نام نہاد الیکشن منعقد کرنے کیلئے پر تول رہا ہے۔ان نام نہاد الیکشنز کا مقصد بلوچ قومی غلامی کو طول دینے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔جب کوئی قبضہ گیر ریاست کسی آزاد مملکت پر قبضہ کرتا ہے تو اس کا بنیادی مقصد اس سرزمین کے وسائل کی لوٹ کھسوٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔اپنے ان استحصالی عزائم کی تکمیل کیلئے وہ ایک ایسا نظام ترتیب دینے کی کوشش کرتا ہے جہاں وہ نا صرف اپنے یہ مکروہ عزائم پورے کر سکے بلکہ عوام کو بھی ایک جانور کی طرح نکیل ڈال کر رکھ سکے۔عوام کو قابو میں رکھنے اور اس لوٹ کھسوٹ کے بازار کو گرم رکھنے کیلئے صرف اسکا قصابی فوج کافی نہیں ہوتا۔اس لیئے وہ اس مقبوضہ قوم میں مراعات یافتہ لوگوں کا ایک ایسا طبقہ تخلیق کرتا ہے، جس کا مقصد قبضہ گیر کے وجود اور عزائم کو دوام بخشنا ہوتا ہے۔ مقبوضہ سرزمین پر وہ اپنے ایسے سامراجی ایجنٹوں کو ایک نام نہاد الیکشن کے ذریعے قوم پر مسلط کرتا ہے۔تاکہ دنیا کو یہ باور کرایا جاسکے کہ یہاں کے لوگ اپنے رضا اور مرضی سے اس ریاست کا حصہ ہیں اور اس سارے استحصالی نظام سے مطمئن ہیں۔

27 مارچ 1948 کو جب سامراجی طفیلی ریاست پاکستان نے آزاد و خودمختار بلوچستان پر اپنے فوجی طاقت کے بل بوتے پر قبضہ کیا تو اسے بھی اپنے قبضہ کو مضبوط کرنے اور اسے جائز قرار دینے کیلئے ایک ایسے ہی طبقے کی ضرورت تھی۔انہوں نے اپنے ان قبضہ گیری عزائم کے تکمیل کیلئے سرداروں اور نوابوں کا چناو کیا۔قبضہ گیر نے نا صرف یہاں سامراجی ایجنٹ سرداروں اور نوابوں کا طبقہ ہی پیدا نہیں کیا بلکہ انہیں ایک متبادل سیاسی قوت اور دوسرے درجے کے حکمران کے طور پر بھی پروان چڑھایا۔لاکھوں بلوچوں کو چند سرداروں کا رعایا بنادیا گیا۔ان سرداروں کو تقویت دینے کیلئے نا صرف عدالت کا نظام ان کے ہاتھوں میں تھما دیا گیا بلکہ ان کی حفاظت اور عوام کو قابو میں رکھنے کیلئے لیویز کا بھی ادارہ بنایا گیا۔پھر ایسی تعلیم متعارف کی گئی جس کا مقصد صرف حرف شناسی سے زیادہ اور کچھ بھی نہ ہو اور یہ تعلیم بھی صرف چند مخصوص لوگوں تک ہی محدود رکھا گیا۔پھر فوج کو اس طرح منظّم کی گئی کے وہ اس سرداری نظام، اس کے محافظ لیویز، اس کی بنیادیں مضبوط کرنے والا تعلیمی نظام ان سب پر نگران کے طور پر کام کرے۔

لیکن جب یہ سارا نظام منظّم کرنے کے باوجود بھی سردار کمزور ہوتے گئے اور اس کے مفادات کی نگرانی اس طرح نا ہوسکی جس طرح وہ چاہ رہے تھے۔تو انہوں نے اس غرض سے اپنا نام نہاد پارلیمانی نظام یہاں پر مسلط کر دیا۔اپنے اس پارلیمانی نظام کے تحت اس نے نا صرف انہی سرداروں کو نمائندہ بنا کر انہیں اور مضبوط کر لیا، بلکہ ایک ایسا نام نہاد قوم پرستوں کا ٹولہ بھی تخلیق کیا جو اس کے نوآبادیاتی عزائم پر جائز کا ٹھپہ لگا سکے۔اس بات کا بین ثبوت موجودہ نام نہاد بلوچ کش پارلیمنٹ ہے جہاں 14 میں سے 11 وزیر سردار ہیں، اور پارلیمنٹ کے 80 فیصد ممبر قبضہ گیر کے بنائے ہوئے سردار، میر و متبر ہیں ۔اب پاکستان نا صرف ان سرداروں کو مضبوط کر کے عوام کو ان کے ذریعے قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا ہے بلکہ ایک وطن فروشوں کا ٹولہ قوم پرستی کے لبادے میں اوڑھ کر دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ بلوچ اس ناجائز قبضہ اور اپنے استحصال و لوٹ کھسوٹ کے حق میں ہیں۔اس 7 دسمبر کو قبضہ گیر ریاست پاکستان دنیا کے آنکھوں میں دھول جھونکنے اور بلوچ قومی غلامی و استحصال کو دوام بخشنے کیلئے ایک نام نہاد لوکل باڈی الیکشن کا انعقاد کر رہا ہے، تاکہ اس الیکشن کے ذریعے وہ اپنے مقامی دلالوں کی ٹولی چُن سکے اور پھر ان کے

ذریعے اپنے مقامی ڈیتھ اسکواڈز کو اور مضبوط کر سکے۔

آج بلوچ اپنی قومی آزادی اور آنے والی خوشحال مستقبل کی خاطر قبضہ گیر ریاست کے ساتھ برسرِ پیکار ہے۔ بلوچ سرمچاروں اور آزادی پسند سیاسی کارکنان نے اپنے بہادری اور کامیاب حکمت عملیوں کی وجہ سے قبضہ گیر ریاست پاکستان کو شکست کے کگار تک پہنچا چکے ہیں۔اس کی معیشت بربادی تک پہنچ چکی ہے۔ پورے بلوچستان سے اس کا وجود ختم ہوتا جارہا ہے۔قبضہ گیر بلوچ سرزمین پر اپنی آخری سانسیں گن رہا ہے۔اپنے وجود کو قائم رکھنے کیلئے وہ نا صرف اپنے پورے فوجی طاقت کے ساتھ اپنے جیٹ طیاروں اور گن شپ ہیلی کاپٹروں سے بلوچ آبادیوں پر حملہ کر رہا ہے بلکہ ہر جگہ اپنے مقامی دلالوں کے ذریعے ڈیتھ اسکواڈز بنا چکا ہے۔جن کے ہاتھوں ہزاروں کی تعداد میں بلوچ اغواء اور شہید ہو چکے ہیں۔ان شہیدوں کے بہتے لہو کی وجہ سے آج پوری دنیا تک ہماری آواز پہنچ چکی ہے۔آج نا صرف عالمی میڈیا بلکہ امریکہ کے ایوانوں تک میں آزاد بلوچستان کی صدا گونج رہی ہے۔ایسے عالم میں جب پوری دنیا پاکستان کے دہشت گردانہ کاروائیوں سے بیزار آچکی ہے وہیں انہیں بلوچ جیسے مہذب اور روشن خیال قوم کی آزادی کی کمی بھی بہت محسوس ہورہی ہے۔قبضہ گیر ریاست پاکستان پوری مہذب دنیا میں بلوچستان کی آزادی کی حمایت اور بلوچ نوجوانوں کی میدان جنگ میں شجاعت دیکھ کر بوکھلا چکا ہے۔وہ اب کسی بھی طرح ایک نام نہاد الیکشن کر کے دنیا کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ بلوچ آزادی نہیں چاہتے بلکہ پاکستان کے اندر رہ کر اس کے پارلیمنٹ کے ذریعے مراعات چاہتے ہیں۔

اس لیئے تمام غیرت مند بلوچوں سے اپیل کی جاتی ہے کے وہ اپنے شہید ہونے والے بھائیوں جنہوں نے اپنا خون صرف ہم سب کے آنے والی روشن اور خوشحال مستقبل کی خاطر بہایا ان کے خون اور قربانیوں کا پاس رکھتے ہوئے قبضہ گیر ریاست پاکستان کے اس نام نہاد الیکشن کا مکمل بائیکاٹ کر کے دنیا پر یہ واضح کر دیں کے وہ اپنے مرضی کے ساتھ اس قبضہ گیر ریاست کا حصہ نہیں بنیں ہیں بلکہ ان پر قبضہ کیا گیا ہے اور یہ الیکشن ان پر تھوپی جارہی ہے۔تمام بلوچ الیکشن کے دن اپنے گھروں سے باہر نہیں آکر یہ ثابت کر دیں کے وہ مزید اس قبضہ گیری اور استحصالی نظام کا حصہ بننے کو تیار نہیں ہیں۔ ہر ذی شعور، غیرت مند، قوم دوست بلوچ قبضہ گیر ریاست پاکستان کے اس الیکشن نما ڈرامے کے ناکامی میں اپنا کردار ادا کر کے آزاد بلوچستان کے حق میں اپنا خاموش ووٹ دے دیں۔

چند مراعات اور خواہشات کی تکمیل پر اپنے غیرت قومی کو ترجیح دینا صرف غیرت مند قوموں کو طرہ امتیاز ہوتا ہے۔

جدوجہد آخری فتح تک

آزاد بلوچستان زندہ باد

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد

” جو ادارے اور سیاسی نظام نا انصافی کا ارتکاب کرتے ھیں انھیں بے نقاب کئے بغیر امن کی بات کرنا منافقت سے بھی بڑی چیز ھو گی “

((((ارون دھتی رائے))))

انسانی حقوق کا عالمی دن اور بلوچ

پمفلٹ

10 دسمبر کو عالمی سطح پر ہر سال یومِ انسانی حقوق کے طور پر منایا جاتا ہے۔ جس کا مقصد 1950 میں اقوام متحدہ کی جانب با قاعدہ جاری شدہ اس اعلامیہ کی پاسداری ہے، جو دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے بعد جنم لینے والی سنگین انسانی المیے کے بعد سامنے آیا تھا۔ یہ اعلامیہ دُنیا بھر میں لینے والے بلا تفریق رنگ و نسل ،جنس و قومیت اور فرقہ و مذہب اربوں انسانوں کے ہر قسم کی بنیادی انسانی حقوق کے دفاع اور تحفظ کا ضامن قرار پایا ہے۔ جن میں ان کی قومی ، سیاسی ، ثقافتی ، معاشرتی ، معاشی اور مذہبی آزادی شامل ہیں ۔ اعلامیہ کی رُوح سے چونکہ تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوتے ہیں لہذا انہیں ہر قسم کی شخصی اور قومی غلامی کے خلاف اپنی جان مال آزادی کی دفاع اور ذاتی تحفظ کا حق حاصل ہے۔ نیز اظہار رائے کی آزادی سمیت کسی انسان کو جسمانی اذیت پہنچانے اور ذلت آمیز سلوک روا رکھنے کی قطعاً گنجائش نہیں ۔ بالخصوص اقوام متحدہ کے رُکن ممالک کو نہ صرف خود اس کی پاسداری کا پابند بنا دیا گیا ہے، بلکہ دنیا بھر میں اس کی پر چار اور نافذ العمل ہونے کے لئے مئوثر اقدامات اُٹھانے کی تلقین بھی کی گئی ہے۔ اقوام متحدہ کے ان رُکن ممالک میں پاکستان بھی شامل ہے، جو قانونی اعتبار سے بین الاقوامی اعلامیہ کی پاسداری کا پابند ہونے کے باوجود اس کے برعکس اس طرح کے کردار کا مالک ہے۔ پاکستان نہ صرف عالمی امن وسلامتی کے لئے خطرے کی علامت بنا ہوا ہے، بلکہ خطے کے تاریخی اقوام کی آزادی سلب کرنے کا مرتکب بھی ٹھہرا ہے۔ جن میں سندھی اور بلوچ بھی متاثر ہیں ۔ اپنے قیام کے فوری بعد جب پاکستان نے تمام انسانی ، اخلاقی و قانونی اقدار و اُصولوں کے ماوراء 27 مارچ 1948 کو آزاد بلوچستان پر فوج کشی کر کے بلوچ قوم پر جبراً اپنی بالادستی قائم کی ، تب سے آج تک بلوچ قوم کی بنیادی انسانی حقوق داؤ پر لگ چکے ہیں، جہاں ان کی جان مال ،عزت و آبرو اور تہذیب وثقافت پر روز کھلواڑ کیا جاتا ہے۔ بلوچ چاہتے ہیں کہ پاکستانی قابض افواج ان کی سرزمین پر غیر قانونی قبضہ ختم کر کے پُر امن طریقے سے اپنے مُلک لوٹ جائیں ، مگر بجائے اس قومی وسیاسی مئوقف پر عمل درآمد کرنے کے، پاکستان اور اس کی استعماری فورسز پر اس انسانی پیکر کو نیست و نابود کرنے پر تُلے ہوئے ہیں جو بلوچ قومی بقاء اور بنیادی انسانی حقوق کی تحفظ کا آواز بن کر اُبھرتا ہے، آزادی اظہار پر قدغن لگا کر بلوچ سیاسی رہنماؤں و کارکنوں کو جبری اغواء کر کے خُفیہ اذیت گاہوں میں لے جا کر انسانیت سوز تشدد کے بعد ،،کلِ اینڈ ڈمپ KILL AND DUMP،، پالیسی کے تحت ان کی مسخ شدہ لاشیں پھینک دی جاتی ہیں، عورتیں و بچے تک ان کی شر سے محفوظ نہیں ۔ پاکستانی افواج بلوچ آبادیوں پر بلا تفریق آتش و آہن برسانے اور معصوم و نابالغ بچوں و عورتوں کو شہید کرنے جیسے ننگی جارحیت کا ارتکاب کرنے سمیت اپنے گماشتہ سرداروں نوابوں مُلاؤں و بد معاش گروہوں کے زریعے اغواء برائے تاوان ، چوری ڈکیتی ڈاکہ زنی، منشیات کے پھیلاؤ ، قتل و غارتگری اور مذہبی شدت پسندی کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف جہاں پاکستان نے بلوچ قوم کی احساسات کو دبا کر انتہائی بے رحمی سے سیاسی سماجی و معاشی استحصالیت پر تہیہ رکھا ہے، وہیں تنگ نظری ، محدود سوچ عدم برداشت ، آپسی اُلجھنیں ، عدم رواداری ، بدنظمی ، لاقانونیت اور نا انصافی جیسے سوچ کو پروان چڑھا کر بلوچ سماج کو مفلوج کر دیا ہے، سامراجی واستحصالی مقاصد کے حصول کے لئے پاکستان نہ صرف خود عالمی مروجہ قوانین اور انصاف پر مبنی اصولوں کو خاطر میں نہیں لاتا بلکہ انسانی حقوق کے لئے صدا بلند کرنے والے مفکر، ادیب، دانشور، صحافی اور انسانی حقوق کے علمبردار سرگرم کارکنوں کو بھی وحشت کا نشانہ بناتا ہے، بلوچ قومی دانشور مفکر پروفیسر صباء دشتیاری ، بی ایس او آزاد کے سابقہ چیر مین ثناء سنگت اور بی آر پی کے جلیل ریکی، استاد نذیر مری، دانشور وصحافی حاجی عبدالرزاق ، ادیب و دانشور ایڈوکیٹ علی شیر کُرد، لاپتہ بلوچوں کی آواز ایڈوکیٹ زمان مری، جرنلسٹ رزاق گل، صحافی لالا حمید جاوید نصیر رند، الیاس نذر انسانی حقوق کمیشن کے سرگرم کارکن صدیق عیدو کو ماورائے عدالت اغواء کر کے بدترین تشدد کے بعد قتل کر دیا گیا، اور بی ایس او کے سابقہ وائس چیرمین ذاکر مجید، بی این ایم کے ڈاکٹر دین محمد، 20000 ہزار کے قریب بلوچ غائب ہیں، جبکہ رواں سال نومبر کے اواخر میں کیچ بار ایسوسی ایشن کے رکن انسانی حقوق کمیشن پاکستان ٹاسک فورس مکران کے لاء اینڈ آرڈر کے سربراہ ایڈوکیٹ حیدر کے بی کو پاکستانی خفیہ اداروں کے اہلکاروں نے اغواء کر کے لاپتہ کر دیا ہے۔ ساتھ ہی انسانی حقوق کے لئے چار سالوں سے سرگرم عمل ماما قدیر بلوچ اور ساتھیوں کو بھی حراسال کرنے کا سلسلہ جاری ہے، متذکرہ تمام سفاکیت اور نا انصافیوں کے خلاف بلوچ نے بحیثیت قوم سیاسی و جمہوری طریقے سے ہر فورم پر آواز اٹھایا ہے، انسانی حقوق کے علمبردار عالمی اداروں اقوام متحدہ ، ایمنسٹی انٹرنیشنل ، ہومن رائٹس واچ ، اینٹی سلیوری انٹرنیشنل ، ہیومن رائٹس ڈیفنس، فیڈم خرام ٹارچر، ایشین ہومن رائٹس کمیشن و دیگر سمیت انسان دوست اقوام کو اس انسانی المیے کا نوٹس لینے اور مداخلت کی بار ہا اپیل کی گئی ہے۔ مگر اسے نظر انداز کرنے کا شرمناک روش تا حال برقرار ہے۔ اسی لئے یہ مسئلہ مزید پیچیدہ اور گھمبیر ہوتا جا رہا ہے۔

اگرچہ بلوچ اپنے قومی جذبہ و ایمان اور خود انصاری سے دشمن قوتوں کے خلاف ایک طویل عرصے سے نبرد آزما ہیں۔ مگر عظیم تر انسانی مفاد میں دنیا کے امن پسند و انصاف پسند طبقات کو آگے آکر بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ یقینی بنانے کے لئے حل طلب بلوچ قومی مسئلے کو اپنی ترجیحات میں شامل کر کے عملی اقدامات اُٹھانے کی ضرورت ہے، جوان کی خلاقی زمہ داری بھی ہے۔

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد

دسمبر کے مہینے میں بی ایس او آزاد کے اخباری بیانات

ادارہ

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد)

تاریخ:2 دسمبر 2013

10 دسمبر انسانی حقوق کے عالمی دن بلوچستان بھر میں یوم سیاہ منایا جائیگا۔ بی ایس او (آزاد)

پاکستانی جبر اور عالمی اداروں کی خاموشی نے بلوچستان کو انسانی حقوق سے ماورا خطہ بنادیا ہے۔

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی کال کے پر 10 دسمبر انسانی حقوق کے عالمی دن کو بلوچستان بھر میں یوم سیاہ منایا جائیگا بلوچستان میں قابض پاکستان نے عالمی قوانین اور انسانی حقوق کی پامالی کی انتہا کر دی ہے لیکن عالمی قوانین اور انسانی حقوق کے دعوے داروں کی بے حسی تا حال قائم ہے جس سے بلوچ سرزمین پر انسانی حقوق اور عالمی قوانین کے دعوے صرف لفاظی رہ گئے ہیں پاکستانی قبضہ گیر ریاست کی جبر اور اقوام متحدہ، انسانی حقوق کے عالمی اداروں اور عالمی قوانین کے دعوے دار ملکوں کی بے حسی نے انسانی حقوق کے تصورات کو بلوچستان میں بے معنی ثابت کر دیا ہے بلوچستان حقیقی معنوں میں ایک انسانی حقوق سے ماورہ خطے کی صورت اختیار کر چکا ہے بلوچستان پر پاکستان نے 1948 میں قبضہ کر کے پوری بلوچ قوم کی حق آزادی پر وار کیا اور تب سے آج تک پاکستان بلوچ قوم کی آزادی کے دفاع کیلئے اٹھنے والے آوازوں کو خاموش کرنے کیلئے نسل کشی میں مصروف ہے لیکن آزادی، انسانی حقوق اور نسل کشی کے خلاف کردار ادا کرنے والے عالمی اداروں نے پاکستانی جبر کو مکمل درگزر کر دیا ہے اور کھلے آنکھوں پاکستان کی جانب سے عالمی قوانین کی پامالیوں کا نظارہ کرتے ہوئے چھپ سادھے بیٹھے ہیں گزشتہ 6 دہائیوں سے بلوچ سرزمین اور اس کے قیمتی وسائل کی لوٹ مار کرتے ہوئے پاکستان نے اپنے تمام تر توانائیاں بلوچ نسل کشی پر صرف کر دی ہے جس کا تسلسل تا حال جاری ہے جس کیلئے پاکستان برائے راست عالمی اداروں اور ممالک سے مدد و تعاون حاصل کر رہا ہے وسیع پیمانے پر بلوچ آبادیوں پر حملوں، لاکھوں بلوچوں کو بے گھر کرنے، ہزاروں کو اپنے عقوبت خانوں میں جبری بند رکھنے، بلوچ سماج کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی جبری اغواء اور ان کو انسانیت سوز تشدد کا نشانہ بنا کر ان کی مسخ شدہ لاشیں پھینکنے جیسے انسانیت سوز کاروائیاں کر کے پاکستان نے بلوچ سرزمین پر اپنا قبضہ مضبوط کرنے کی کوشش کی ہے اور تا حال بلوچستان کے کھونے کھونے میں قابض فوج بلوچ آبادیوں پر حملوں، فرزندوں کو سرے عام اغواء اور مسخ شدہ لاشیں پھینکنے میں مصروف ہے بلوچ قوم کی جانب سے دنیا کے ہر فورم پر پاکستانی جبر کے خلاف آواز اُٹائی گئی ہے لیکن موجودہ صدی کو انسانی حقوق کی صدی قرار دینے والے عالمی انسانی حقوق کے علمبرداروں کو بلوچستان کی صورتحال نظر نہ آرہی وائس پار بلوچ مسنگ پرسن کی 750 کلومیٹر سے زائد کا تاریخی لانگ مارچ، عالمی انسانی حقوق اور میڈیا کی رپورٹس سمیت عالمی فورمز پر اٹھائی جانے والی آوازوں کے بعد بھی اقوام متحدہ سمیت عالمی انسانی حقوق کے دعوے دار ممالک کی مجرمانہ خاموشی ان کے کردار کی عکاس ہے اس تشویش ناک صورتحال کے رہتے بلوچستان میں عالمی انسانی حقوق کے دعوے کھوکلے ہو چکے ہیں جس کے ردعمل میں 10 دسمبر عالمی یوم انسانی حقوق پر بلوچستان میں پاکستانی جبر اور عالمی اداروں کی مجرمانہ خاموشی کے خلاف یوم سیاہ منایا جائیگا۔

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد)

تاریخ: یکم دسمبر 2013

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ قابض فوج نے بلوچستان بھر میں دہشتگردانہ کاروائیوں کو تیز کر دیا ہے خاران، خضدار، مشکے، آواران، نال، گریشہ، پنجگور سمیت بلوچستان کے مختلف علاقوں میں قابض فوج نے اپنے مقامی گماشتوں کے ساتھ مل کر بلوچ آبادیوں پر حملوں اور لوگوں کو تشدد و تزلیل کا نشانہ بنانے کا سلسلہ شروع کیا ہے خاران میں گزشتہ کئی روز سے قابض فوج کے ڈیتھ اسکواڈز نے ہندو تاجروں کو تنگ کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے ہندو تاجروں کے گھروں پر بلا اشتعال

فائرنگ کی جاتی ہے جس سے علاقے میں ان کا جینا محال ہو چکا ہے جبکہ دوسری جانب بلوچستان بھر میں بلوچ فرزندوں کے جبری اغواء اور مسخ شدہ لاشیں پھینکنے کا سلسلہ شدت کے ساتھ جارہے گزشتہ روز 6 مہینے قبل قابض فورسز کے ہاتھوں اغواء ہو چکے جاوید بلوچ کی لاش منگوچر کے پہاڑوں میں پھینکی گئی جبکہ حب دارو ہوٹل کے مقام سے قابض فورسز نے دکاندار محمد اسلم ولد لال بخش کو اغواہ کرلیا چند روز قبل چاہسر دشت مارکیٹ سے قابض فوج اور آئی ایس آئی کے کارندے بلوچ وکیل اور انسانی حقوق کے سرگرم کارکن 33 سالہ حیدر کے بی ولد خدا بخش کو اغواء کر کے اپنے ساتھ لے گئے کوشقلات کے رہائشی حیدر کے بی ہیومن رائٹس کمیشن آپ پاکستان کے اسپیشل ٹاسک فورس کے ممبر بھی ہیں اس سے قبل گزشتہ برس ایچ آر سی پی کے کوآرڈینیٹر اور انسانی حقوق کے سرگرم کارکن صدیق عیدوں کو قابض فورسز نے اغواء کر کے شہید کر دیا تھا جبکہ گزشتہ روز سوئی سے قابض فوج نے منگل ولد جلالان، چنجول ولد منگل، لطیف ولد منگل مراد ولد لابا محمد ولد گوہرام بگٹی کو اغواء کر کے اپنے ساتھ لے گئے ترجمان نے مزید کہا کہ ماما قدیر کی سربراہی میں تاریخی لانگ مارچ کی پزیرائی اور حمایت کو دیکھ کر پاکستانی میڈیا اور قابض اداروں ایک مرتبہ پر اپنے خوش نما نعروں اور پرفریب دعوں کے ساتھ میدان میں اتھر چکے ہیں قابض فوج کے ہاتھوں جبری اغواء ہو چکے بلوچوں کے اہل خانہ کی تاریخی جدوجہد دنیا کی توجہ بلوچوں کے جبری اغواء کی جانب مبذول کرا چکی ہے جسے کاونٹر کرنے اور جبری اغواء کیئے گئے بلوچوں کے اہلخانہ اور بلوچ عوم کو دھوکہ دینے کیلئے پاکستانی ریاستی عہدیدار بلند و بانگ دعوے کررہے ہیں جبکہ پاکستانی قابض عدلیہ نے ایک مرتبہ پھر قابض فورسز کے سزا و جزا اور بلوچوں کی بازیابی کے اقدامات کا شوشہ چھوڑنا شروع کر دیا ہے لیکن ان تمام تر دعوں کے ساتھ بلوچستان کے کھونے کھونے میں بلوچ فرزندوں کے اغواء اور شہادتوں کے تسلسل میں شدت آتی جارہی ہے جب ماما قدیر کا قافلہ لانگ مارچ میں تھا تب بھی قابض فوج بلوچ فرزندوں کے اغواء اور مسخ شدہ لاشیں پھینکنے کے تسلسل کو جاری رکھے ہوئے تھا اور اب بھی پاکستانی عدلیہ اور حکومتی دعوں کے باوجود بلوچ فرزندوں کے اغواء اور شہادتیں اسی شدت کے ساتھ جارہی ہیں جب بلوچ قوم پر پاکستانی ظلم و جبر اور بلوچ فرزندوں کے جبری اغواء کی آواز دنیا کے کھانوں میں گھونجنے لگتی ہے تو اس آواز کو خاموش کرنے اور اپنے قبضہ گیریت کے تحفظ کیلئے قابض کے تمام ادارے میدان میں کھود پڑھتے ہیں لیکن بلوچ قوم پاکستانی قابض اداروں کے ان چکروں میں آئے بغیر اپنی جدوجہد کو جارر کھے ہوئے ہے جب تک عالمی ادارے بلوچ فرزندوں کے اغواء اور شہادتوں اور بلوچستان میں پاکستانی قبضہ گیریت کے خلاف عالمی قوانین کے مطابق اپنا کردار ادا نہیں کرتے تب تک بلوچستان کی صورتحال کی سنگینی اسی طرح برقرار رہے گی۔

^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد)

تاریخ:4دسمبر2013

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ بلوچستان بھر میں قابض فوج کی بلوچ نسل کشی کی کاروائیاں جاری ہیں بلوچستان کے مختلف علاقوں میں دہشتگردارنہ کاروائیوں اور بلوچ فرزندوں کے اغواء میں شدت لائی گئی ہے گزشتہ رات کوئٹہ کے علاقے سٹلائٹ ٹاؤن کے قریب بلوچ ہاسٹل سے قابض فورسز اور خفیہ اداروں نے 19 سالہ طلب عالم مہراب ولد شوکت کو اغواء کر کے اپنے ساتھ لے گئے کلاتک کے رہائشی محراب بلوچ ڈگری کالج تربت میں سکینڈ ائیر کا طالب علم ہے تمپ کے علاقے گوکدان سے قابض فورسز نے بی آر پی کے کارکن اصغر بلوچ کو اغواء کرلیا جبکہ بلوچستان کے مختلف علاقوں میں جاری دہشتگردانہ کاروائیوں کے تسلسل میں گزشتہ روز قابض فورسز نے صحبت پور کے علاقے قادر ملائی میں کئی گھنٹے تک کاروائی کرتے ہوئے دو درجن کے قریب گھروں میں لوٹ مار کے بعد آگ لگا دی گئی اور آپریشن کے دوران آٹھ بلوچوں کو اغوا کیا جن میں سے تین کی شناخت نوبت ولد قاسم شالوانی بگٹی غلابی اور مالی بگٹی کے نام سے ہوئی ہے قابض فوج کی دہشتگردی کے خلاف احتجاج کرنے والے عورتوں اور بچوں کو فورسز نے شدید تشدد کا نشانہ بنایا جس سے ایک خاتون بے ہوش ہوگئیں اور متعدز خمی ہوئے اسی اثناء میں نصیرآباد کے علاقے ڈربی میں قابض فورسز نے علاقے کو محاصرے میں لے کر دہشتگردانہ کاروائی کا اغاز کیا فورسز نے متعدد گھروں کو آگ لگا دی اور ناخوف بگٹی، ہزارو بگٹی اور قادو بگٹی کو فورسز اپنے ساتھ لے گئے جبکہ نیو کاہان میں قابض فورسز نے گھروں کو گیرے میں لیتے ہوئے ایک شخص کو اغواء کیا نیو کاہان اور گردو نواح میں قابض فورسز کی کاروائی جاری ہے ترجمان نے مزید کہا کہ بلوچ ریپبلکن

پارٹی اور بلوچ نیشنل مومنٹ کی جانب سے 7 دسمبر کو ہونے والے پاکستانی بلدیاتی الیکشن کے خلاف 6 اور 7 دسمبر کو شٹر ڈاؤن و پہیہ جام ہڑتال کی کال کی حمایت کرتے ہیں بلوچ عوام ہڑتال کی کال کامیاب بنائیں پاکستان نے اپنے قبضہ گیر الیکشن کے زریعے ہی بلوچستان میں اپنے قبضے کو برقرار رکھا ہوا ہے لیکن بلوچ قوم نے اپنے تاریخی شعور کا مظاہرہ کرتے ہوئے قابض کے عام انتخابات کو ناکام بنا دیا تھا اور انتخابی عمل سے الگ رہ کر پاکستان سے اپنی نفرت اور قومی آزادی پر عزم کا اظہار کیا تھا ایک مرتبہ پھر قابض پاکستان اپنے بلدیاتی انتخابات کے زریعے قبضہ گیر ریاستی علمداری کو مضبوط کرنے کی کوشش کر رہا ہے بلوچ عوام عام انتخابات کی طرح قابض کی بلدیاتی انتخابات سے بھی دور رہ کر قابض سے اپنی نفرت کا ثبوت دیں۔

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد)

تاریخ:7 دسمبر 2013

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ نصیر آباد تربت پنجگور مشکے سمیت بلوچستان بھر میں قابض فوج کی بربریت شدت اختیار کرتا جا رہا ہے گزشتہ روز نصیر آباد کے علاقے بٹی اور آر ڈی 238 میں الاصبح قابض فوج نے علاقے کو محاصرے میں لے کر دہشتگردانہ کاروائی کا آغاز کر دیا جس دوران بی آر پی کے کارکنان خوشال بگٹی حاجی ریاست بگٹی اور کھوسہ بگٹی سمیت 11 بلوچوں کو شہید کر دیا گیا جبکہ متعدد عورتیں اور بچے زخمی ہوگئے اسی اثناء میں محمد اعظم بگٹی اور عالم دین بگٹی کو شہید کر کے ان کی گولیوں سے چھلنی مسخ شدہ لاشیں نصیر آباد کے علاقے کھٹن میں پھینکی گئیں ہیں جنہیں دو ہفتہ قبل سندھ کے علاقے روہڑی سے اغواء کیا گیا تھا جبکہ تربت کے علاقے ڈنک میں قابض فوج اور زرخرید ڈیتھ اسکواڈ کی بلوچ عوام کے خلاف دہشتگردانہ کاروائیوں کے تسلسل میں گزشتہ روز ڈنک کے علاقے میں امام بخش اور سیٹھ مومن کے گھروں پر حملہ کیا گیا جس دوران قابض فوج اور ڈیتھ اسکواڈ کے کارندوں شدید فائرنگ کی اور گھروں میں گھس کر موجود افراد کو شدید تشدد کا نشانہ بنایا اور کمسن الطاف، رحمت سمیت ایک شخص کو اغواء کر کے اپنے ساتھ لے گئے اسی اثناء میں گزشتہ روز پنجگور میں قابض فوج نے گرمکان میں شہید فراز کے گھر سمیت دوسرے گھروں پر حملہ کر موجود افراد کو شدید تشدد کا نشانہ بنایا جبکہ قابض فوج کی مشکے میں زلزلے سے متاثرہ بلوچ عوام کو تنگ کرنے کا سلسلہ تاحال جاری ہے گزشتہ روز قابض فوج نے کلار میں عام لوگوں کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے جنہیں شدید تشدد کا نشانہ بنا کر چھوڑ دیا گیا ترجمان نے مزید کہا کہ بلوچ قوم نے قابض پاکستان کے بلدیاتی انتخابات کو مسترد کر کے قومی تحریک آزادی کی مقبولیت کا ثبوت دیا ہے پاکستان دنیا کے سامنے اپنی شکست چھپانے کیلئے انتخابات کے نام پر خود ساختہ سیٹ اپ تشکیل دے کر اپنے گماشتوں کی مراعات کا بندوبست کر رہا ہے جنہیں پاکستان نے منظّم کر کے تحریک آزادی کو کاونٹر کرنے کیلئے استعمال کر رہا ہے اس سے قبل بھی عام انتخابات میں بلوچ قوم نے اپنے قومی شعور اور تحریک آزادی کے ساتھ مضبوط وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے پاکستان کے قابض پارلیمنٹ کو مسترد کر دیا ہے جس سے تحریک آزادی کے خلاف قابض کی ووٹ و الیکشن کے حربے کو غیر موثر ہو چکا ہے۔

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد)

تاریخ:10 دسمبر 2013

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کی جانب سے 10 دسمبر انسانی حقوق کے عالمی دن کو بلوچستان بھر پاکستان قبضہ گیریت، انسانی حقوق و عالمی قوانین کی پائمالی عالمی اداروں، اقوام متحدہ کی خاموشی کے خلاف یوم سیاہ منایا گیا بی ایس او آزاد کے مرکزی ترجمان نے کہا کہ پاکستان نے 28 مارچ 1948 سے بلوچستان پر قبضہ کر کے بلوچ قوم کے تمام حقوق غصب کر لیا جس کے بعد سے آج تک انسانی حقوق اور دیگر عالمی قوانین سے بلوچستان کو ماورہ رکھا گیا ہے وسیع پیمانے پر انسانی حقوق اور عالمی قوانین کی پامالیاں آج ریکارڈ پر آچکی ہیں لیکن اقوام متحدہ سمیت انسانی حقوق کے دعوے دار کسی بھی ادارے نے بلوچستان میں جاری اس درندگی اور انسانی حقوق کے پائمالی کو قابل تدارک نہ سمجھا اس صورتحال میں انسانی حقوق کے عالمی دن کی اہمیت پہلے سے ختم ہو جاتی ہے بلکہ بلوچستان کی صورتحال عالمی اداروں اقوام متحدہ اور انسانی حقوق

کے اداروں کے دعووں اعلامیوں اور عالمی قوانین پر سوالیہ نشان ہے 1948 میں انسانی حقوق کے عالمی چارٹر کی منظوری اور اس کے بعد انسانی حقوق سے متعلق متعدد اعلامیوں اور قراردادوں کے باوجود گزشتہ 6 دہائیوں سے بلوچ نسل کشی، بلوچ عوام کے حق آزادی کی محرومی، فرزندوں کے دن دھاڑے اغواء اور شہادتوں کا سلسلہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا اگر چہ پاکستان دنیا میں انسانی حقوق پر عملدرآمد کیلئے مثالی حیثیت نہیں رکھتا بلوچستان سمیت پاکستان کی انسانی حقوق کی پامالیاں اس کے اپنے عوام تک بھی پہلی ہوئی ہیں جس کا اظہار اقوام متحدہ یورپی ممالک اور امریکی سمیت دنیا بھر کے انسانی حقوق کے ادارے متعدد بار کر چکے ہیں لیکن اس کے باوجود پاکستان کو تا حال عالمی دنیا میں نرم گوشہ حاصل ہے امریکہ یورپی ممالک اور اقوام متحدہ سمیت عالمی انسانی حقوق کے اداروں کا پاکستان کے ساتھ انسانی حقوق پر سمجھوتہ قابل افسوس اور تشویش ناک ہے اقوام متحدہ اور امریکی ادارے بارہاں اپنی رپورٹوں میں پاکستان کی انسانی حقوق کے حوالے سے کردار کا اقرار کر چکے ہیں لیکن ان کا کردار صرف بیانی اقرار تک ہی معدود رہا ہے ہیومن رائٹس واچ، ایمنسٹی انٹرنیشنل، ایشین ہیومن رائٹس کمیشن، ایشین لیگل ریسورس سینٹر اور ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی رپورٹیں بلوچستان میں پاکستانی ریاست کے گناونے کردار کو ظاہر کر چکی ہیں اور پاکستان کے ہاتھوں ہزاروں بلوچ فرزندوں کے اغواء اور شہادتوں کے ثبوت واضع کر چکی ہیں جبکہ ستمبر 2013 میں اقوام متحدہ کی ورکنگ گروپ بھی بلوچستان میں قابض فوج کی نسل کشی کی کاروائیوں کو نمایا کر چکی ہے لیکن ان سب کے باوجود اب تک امریکہ اور یورپی ممالک اقوام متحدہ عالمی ادارے انسانی حقوق پر سمجھوتہ کرتے ہوئے پاکستان کی مالی و سیاسی مدد کر رہے ہیں جو کہ خطے میں پاکستان کے ہاتھوں انسانی حقوق کی پامالی میں شدت کی ایک واظع سبب ہے جس کی وجہ سے پاکستان انسانی حقوق کے عالمی دن پر اور ماما قدیر کی لانگ مارچ اور احتجاجی کیمپ کے باوجود آئے روز بلوچ فرزندوں کے اغواء اور دہشتگردانہ کاروائیوں کے تسلسل میں شدت لاتا جا رہا ہے۔

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد)

تاریخ:5 دسمبر 2013

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی کابینہ کا اجلاس زیر صدارت مرکزی چیئرمین بلوچ خان منعقد ہوا اجلاس میں تنظیمی امور، موجودہ سیاسی صورتحال آئیندہ لائحہ عمل سمیت اہم ایجنڈے زیر بحث تھے اجلاس میں ایجنڈوں پر بحث مباحثے کے بعد اہم فیصلے لیئے گئے کابینہ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مرکزی کابینہ کے ممبران نے کہا کہ عالمی منظرنامے پر حالیہ تبدیلیوں سے عالمی طاقتوں کے مفادات تبدیل ہو رہے ہیں جن کے تحت پاکستان بھی کاونٹر انسرجنسی پالیسیوں میں تبدیلی لاتے ہوئے بلوچ نسل کشی میں تیزی لا چکی ہے امریکہ کے ساتھ ساتھ اس خطے میں چین اور روس کے بڑھتے اثر رسوخ میں پاکستان گماشتہ روش برقرار رکھتے ہوئے چین سے قربت بڑا رہا ہے اور چین کو بلوچستان میں وسیع مفادات فرائم کر رہا ہے جس کے ساتھ ہی آزمودہ حربوں کو استعمال کرتے ہوئے اسلام کے نام پر منظّم دہشتگرد گروہوں اور مذہبی جنونیوں کو کھلی چوٹ دی ہے تا کہ اس خطے میں بدامنی اور دہشتگردی کو فروغ دے کر عالمی منظرنامے پر اپنی اہمیت برقرار رکھ سکے اور عالمی دنیا کے حمایت وامداد کو استعمال کر کے اس خطے میں اپنی قبضہ گیریت اور استحصالی پالیسیوں کی بقاء کر سکے پاکستان نے بلوچ نسل کشی میں عالمی امداد اور عالمی اداروں کی خاموشی کو بھر پور استعمال کیا ہے اور تا حال اسی کوششوں میں ہے کہ عالمی منظرنامے پر ساکھ بچا کر بلوچ نسل کشی کیلئے اپنے ہاتھ مضبوط رکھ سکے پاکستان کے دوغلے کردار اور خطے سمیت دنیا بھر میں بدامنی مذہبی جنونیت اور دہشتگردی پھلانے میں پاکستان کے واضع کردار کے باوجود عالمی ادارے پاکستان کے خلاف قابل ذکر اقدامات کرنے سے گریزاں ہیں لیکن پاکستانی دہشتگرد گروہوں کی کمزوری اور خطے میں عالمی طاقتوں کے مضبوط کردار نے پاکستان کو اپنے دہشتگردانہ پالیسیوں کو مزید وسعت دینے کی جانب ماحل کیا ہے پاکستان عالمی دنیا کے خاموشی دیکھ کر بلوچ نسل کشی کی پالیسیوں کو بلا روک ٹھوک جاری رکھے ہوئے ہے تحریک آزادی کے خلاف مارو اور پھینک دو کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے پاکستان نے چند سالوں میں ہزاروں بلوچ فرزندوں کو اغواء کرنے کے بعد شہید کیا ور لاشوں کو مسخ کر کے پھینک دیا لیکن عالمی اداروں اور انسانی حقوق کے دعوی دار ملکوں کی جانب سے کوئی بھی قابل زکر اقدام دکھائی نہ دی جس سے شہ پاتے ہوئے پاکستان نے بلوچستان کے کھونے کھونے میں اپنی

دہشتگر دانہ پالیسیوں کو تیز کرتے ہوئے روزانہ بلوچ آبادیوں پر حملوں کا نہ رکھنے والا سلسلہ شروع کر دیا ہے لیکن اب بھی دنیا کی خاموشی برقرار ہے اور اسی بے حسی اور مجرمانہ خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان نے زلزلے جیسی قدرتی آفت میں بھی درندگی جاری رکھتے ہوئے زلزلہ زدگان کی امداد روکھنے کے ساتھ ساتھ تباہ حال بلوچوں پر اپنی بربریت جاری رکھی اور اب پاکستان نے اپنے کاونٹر انسرجنسی پالیسیوں کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے اپنے آزمودہ کارندوں مذہبی جنونیوں اور جہادی گروپوں کو تحریک آزادی کیخلاف میدان میں لاکر بلوچ نسل کشی کو ایک نئے اور خونی فیز میں داخل کرنے کی تیاریاں کر چکا ہے بنگلہ دیش کی طرح بلوچستان میں بھی مذہب کے نام پر لوگوں کو تحریک آزادی کے خلاف استعمال کر کے بلوچ نسل کشی کو وسیع پیمانے پر پہلانے کی تیاری کر چکے ہیں بلوچ قوم کی جہد مسلسل اغواء کیے گئے بلوچوں کے اہل خانہ کی ماما قدیر بلوچ کی ہمراہ تاریخی ریلی نے دنیا کے ہر فورم تک بلوچ قوم کے خلاف پاکستانی جبر کی آواز پہنچائی ہے اگر اب بھی عالمی اداروں کی خاموشی برقرار رہی تو دنیا بلوچ نسل کشی میں برابر کی شریک ٹھہریگی موجودہ عالمی صورتحال اور پاکستان کے بدلتے ہوئے کاونٹرانسرجنسی حکمت عملیوں کے سامنے قومی تحریک آزادی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے تحریک آزادی کی سیاسی بنیادوں کو مزید مضبوط کرنا ہوگا بلوچ عوام میں سیاسی شعور اور تحریک آزادی کو مضبوط سیاسی بنیادیں فراہم کر کے ہی ہم بدلتے عالمی صورتحال اور پاکستانی حربوں کا سامنہ کامیابی سے کر پائینگے پاکستان نے اپنے دہشتگردانہ حربوں کے ساتھ ساتھ اپنے الیکشن کے زریعے بلوچ قوم میں موجود اپنے گماشتوں کو مضبوط کرنے اور بلوچستان میں اپنی قبضہ گیر مشینری کو سہارے دینے کی پالیسی کو آگے لے جاتے ہوئے عام انتخابات کے بعد بلدیاتی انتخابات کا ڈھونگ رچایا ہے اور بلوچستان بھر میں بلدیاتی انتخابات کیلئے اپنے گماشتوں کی سرگرمیوں کو تیز کر دیا ہے لیکن بلوچ قوم نے پہلے ہی پاکستانی الیکشن سے اپنے بیگانگی کا اظہار کر دیا ہے پاکستانی بلدیاتی انتخابات بھی عام انتخابات کی طرح ناکامی سے دوچار ہونگے۔

^^

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد)

تاریخ: 11 دسمبر 2013

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ گزشتہ روز انسانی حقوق کے عالمی دن پھر بھی قابض فوج نے اپنی درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلوچ فرزندوں کو شہید کرنے کا سلسلہ جار رکھا پیرکوہ ڈیرہ بگٹی میں بی آر پی کے رہنما بایان بگٹی، صیفل بگٹی اور راضل بگٹی کو شہید کر کے ان کی گولیوں سے چلنی لاشیں پھینکی گئیں بسیمہ میں نور محمد بلوچ کی گولیوں سے چلنی لاش پھینکی گئیں جو کہ قابض فورسز کے ہاتھوں اغواء ہوا تھا ترجمان نے مزید کہا کہ بلوچ قوم کو اپنی وہشت اور بربریت سے زیر کرنے کا پاکستانی خواب چکنا چور ہو چکا ہے پاکستان اپنی شاطر حربوں کو آزماتے ہوئے بلوچ قوم میں اپنے لیے نرم گوشہ پیدا کرنے کی کوششیں کر رہا ہے حالیہ زلزلے کے بعد بڑی تعداد میں آواران اور مشکے میں وارد ہونے والی قابض فوج بلوچوں کو مراعات اور مختلف سہولتوں کا جانسہ دے کر انہیں پاکستانیت کا درس دینے کی کوششیں کر رہا ہے آواران میں لوگوں کو مفت تعلیم ،ٹیکنیکل ٹریننگ اور روزگار دینے کے بہانے قابض فوج کے اداروں میں لے جا کر انہیں تحریک آزادی کے خلاف استعمال کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں کوئٹہ خضدار اور ماڑہ میں قابض فوج کے کنٹونمنٹ بورڈ بھی اسی مقصد کیلئے قائم ہیں کہ ان کے زریعے بلوچوں کو اپنے ہی لوگوں کے خلاف استعمال کر سکیں جس طرح پاکستان مذہب کے نام پر مدرسوں کو استعمال کرتا آرہا ہے اب غریب بلوچوں کی معاشی مجبوریوں اور سادہ لوہی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں تعلیم اور روزگار کے نام پر پھانسے کی کوششیں کی جارہی ہیں بلوچ عوام قابض فوج کی ہر شکل اور شاطر حربے کا بڑی گہرائی سے تجربہ کر چکی ہے پارلیمانی باجگزاروں کے خوش نما نعروں نالی روڈ اور روزگار کے لالچوں سمیت مذہب کا نام استعمال کرنے اور ڈیتھ اسکواڈ کے زریعے قتل و غارتگری اور دہشت پھیلانے سمیت تمام سامراجی حربوں کا سامنہ کرتے ہوئے اپنے جدوجہد آزادی کو جاری رکھے ہوے ہیں اور سرزمین بلوچستان کو قابض اور اس کے ایجنٹوں کیلئے تنگ کر چکی ہیں جس کی واضع مثال قابض فوج کی درندگی کی ناکامیوں کے بعد اپنے حکمت عملیوں کو تبدیل کرتے ہوئے بلوچ عوام کو ایک مرتبہ پھر مراعات کے نام پر ٹھگانے کی کوششیں ہیں۔

^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^^

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد

تاریخ:15 دسمبر 2013

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ قابض کا جبر وتشدد اور نسل کشی کی کاروائیاں بلوچ قوم کی جدوجہد کو متزلزل نہیں کرسکتی وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کی تاریخی لانگ مارچ اپنے حق اور ظلم و جبر کے خلاف جدوجہد اور ثابت قدمی کی روشن مثال بن چکی ہے کوئٹہ تا اسلام آباد طویل مارچ نے بلوچ قوم پر ہونے والے پاکستانی جبر اور بلوچ فرزندوں کے جبری اغواء اور شہادتوں کی گھونج دنیا کے کونے کونے میں پہنچا دی ہے ماما قدیر اور ان کے ہمراہ بلوچ مرد و خواتین اور کمسن بچوں کے عزم اور طویل و پر کھٹن مارچ کے باوجود دنیا کی بے حسی اور مجرمانی خاموشی برقرار ہے پاکستانی گماشتے اور قبضہ گیر ادارے اپنے چالبازیوں اور دلاسوں سے لانگ مارچ کے روکھنے اور مارچ کے شرکا کے عزم کو توڑنے کی کوششیں کرتے رہے لیکن ان کی تمامتر کوششیں ماما قدیر اور ان کے ساتھوں کے قدموں کو نہ روکھ سکیں پاکستان نے دنیا کی مجرمانہ خاموشی سے شہ پاتے ہوئے وائس فار بلوچ مسنگ پرسنز کی ریلی کے دوران ہی بلوچ فرزندوں کے اغواء اور شہادتوں کے تسلسل کو جاری رکھا گزشتہ روز قابض فورسز کے ہاتھوں اغواء کیئے گئے پنجگور کے رہائشی افضل بلوچ کو شہید کر کے ان کی لاش پھینکی گئی پاکستانی قابض فوج بلوچوں کے جبری اغواء اور شہادتوں کے تسلسل کو جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ بلوچ نسل کشی کو تیز کرنے کیلے نئے حربے آزمارہا ہے بلوچستان بھر میں پہلے سے جاری مذہب کے نام پر مسلح گروہوں کو منظم کر کے انہیں تحریک آزادی کے خلاف استعمال کرنے کی پالیسیوں کو مزید وسعت دی گئی ہے جس کے ساتھ ساتھ مکران سمیت مختلف علاقوں میں فوجی نقل و عمل میں تیزی لائی گئی ہے اقوام متحدہ سمیت عالمی دنیا کی مجرمانہ خاموشی پاکستان کی جبر میں شدت کا سبب ہے جس کے اثرات پورے خطے میں پھلے ہوئی ہیں جہاں انسانی حقوق سمیت عالمی قوانین کی حیثیت صرف برائے نام رہ گئی ہے ظلم و جبر کے اس چکر کو ختم کرنے کیلئے اقوام متحدہ عالمی ممالک انسانی حقوق کے ادارے اپنا کردار ادا کریں اور اپنے دعوں پر پورا اتھرتے ہوئے پاکستانی جبر کا ہاتھ روکھیں۔

ˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇ

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد)

تاریخ:22 دسمبر 2013

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ مریکہ کی جانب سے پاکستان کی امداد مشروط کرنا ایک ہم پیش رفت ہے پاکستان عالمی قوانین کی پامالیوں کے تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے دہشتگردی کے خلاف عالمی امداد حاصل کر کے اسے بلوچ اور سندھیوں کی نسل کشی سمیت اپنے دہشتگردانہ مقاصد کیلئے استعمال کررہا ہے عالمی امداد کی یہی فراہمی پاکستانی دہشتگردی اور بلوچ نسل کشی کی کاروائیوں میں شدت کا سبب ہے امریکہ سمیت پاکستان کی امداد کرنے والے دیگر عالمی ممالک اور اقوام متعدہ سمیت عالمی ادارے پاکستان کے حوالے سے اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرتے ہوئے بلوچ نسل کشی اور بلوچستان میں پاکستانی قبضہ گیر فوج کی دہشتگردانہ کاروائیوں کو روکھنے میں اپنا کردار ادا کریں پاکستان تسلسل کے ساتھ بلوچستان کے طول وعرض میں اپنی سفاکیت کو جاری رکھے ہوئے ہے اسی سفاکیت اور جبر کے خلاف ماما قدیر کی تاریخی لانگ مارچ کو روکھنے کیلئے ڈرانے دھمکانے سمیت ہر طرح کے حربے آزمائے جاچکے ہیں لانگ مارچ کے ابتدا سے ہی انہیں قدم قدم پر روکھنے کی کوششیں کی گئی جبکہ پاکستانی فورسز عالمی قوانین کی پامالیوں کے تسلسل میں افغانستان میں بلوچ معاجرین کو ٹارگٹ کررہے ہیں جو کہ عالمی قوانین کی پامالی ہے عالمی ادارے دنیا کے دیگر خطوں کی طرح بلوچستان میں بھی قبضہ گیریت کے شکار بلوچ قوم پر عالمی قوانین کے اطلاق پر عمل درآمد کریں بلوچ معاجرین کو عالمی قوانین کے مطابق تحفظ دے کر پاکستان کی جانب سے افغانستان میں پناہ گزین بلوچوں کے خلاف کاروائیوں پر عالمی قوانین کے مطابق کاروائی کرے۔

مرکزی ترجمان

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد)

ˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇˇ